

# مردیسا

## شوکت تھانوی



# بہر و بیجا

شوکت تھانوی

حُسامی بک ڈپو

پھل کھان، حیدرآباد ۲۰۰۰۰۵



---

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

---

اشاعت ۱۹۸۴ء

تعداد ایک ہزار

طباعت گولڈن پریس حیدرآباد

ناشر حسامی بک ڈپو

مچھلی کمان، حیدرآباد (انڈیا)

”نہ تناقا ضمیمہ اندک طلبیم“ والا مقولہ بھائی مقصود کے لئے  
 تھا، اور بھائی مقصود..... اس مقولہ کی انسانی شکل میں،  
 دنیا کا کوئی علم اور فن ایسا نہ تھا جس میں ٹانگ اڑاتے ہوئے  
 ان ذاتِ شریف کو ذرا بھی تا مل ہو۔ حالانکہ صرف ہماری نہیں بلکہ  
 کالج بھر کی یہی رائے تھی کہ یہ حضرت ہر شعبہ زندگی میں بالکل صفر  
 واقع ہوئے تھے۔ مگر اس غلط فہمی کا کیا علاج کہ اپنے آپ کو وقتِ  
 مقررہ کا بقراط سمجھتے تھے اور ذہن میں یہ جم گیا تھا کہ دنیا کا کوئی کام  
 ایسا نہیں ہے جس کو میں نہ انجام دے سکوں، پولین کی طرح آپ



کی لغت میں بھی ناممکن کا مفہوم پیدا کرنے والا کوئی لفظ نہ تھا۔ طالب علم تو خیر تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر آپ تھے، ادیب آپ تھے، موسیقی میں آپ کو بہارت حاصل تھی، کھانا پکانے میں شاہی باورچی بھی آپ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے، کپڑا سینے کا آپ کو ایسا دعویٰ تھا کہ کیا کسی سات پشت کے درزی کو ہوگا، کپڑا دھونے میں کیپٹل لانڈری لکھنؤ کے چابکدست دھوبیوں کے کان کاٹتے تھے، طبی تجربہ یہ کہ یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے شفاء الملک اور سول سرجن آپ کے سامنے طفل مکتب تھے، مذہبی معلومات میں ملا صاحب شور بازار کا پھرکتا ہوا جوڑا اگر کوئی تھا تو صرف بھائی مقصود، مختصر یہ کہ آپ انجینئر تھے، آپ وکیل تھے، آپ ماہر سیاست تھے، آپ ملک التجار تھے، آپ پہلوان تھے، آپ مصور تھے، آپ فلاسفر تھے، اور آپ سب کچھ تھے۔ بس دیر اس کی ہوتی تھی کہ ہمارے بھائی صاحب کے سامنے کسی قسم کی کوئی بحث چھڑ جائے تو پھر دیکھتے آپ کا تجربہ، معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص معلومات کا ایک موجیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ اور اس بحث خاص میں اس سے زیادہ معلومات دنیا میں کسی کو نہیں ہو سکتیں۔

نظر ہی تو ہے اتفاق سے باورچی خانے کی طرف اٹھ گئی اور

آپ نے باورچی کو گوشت بھوتے ہوئے دیکھ لیا۔

کہنے لگے

”تمہیں خدا کی قسم ذرا دیکھنا اس گدھے کے بچے کو، یہ

گوشت بھون رہا ہے۔“

ہم نے دیکھا تو واقعی وہ گوشت بھون رہا تھا مگر ہماری

سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں گدھے کے بچے ہونے کی کونسی بات

ہے، لاکھ لاکھ غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے کہا۔

”آخر وہ کیا کر رہا ہے؟“

کہنے لگے۔ ”ہشت“ اور زور سے باورچی کو پکار کر کہا۔

”یہ گوشت بھون رہے ہیں یا ڈنڈھیل رہے ہیں۔ اتنے

دن ہو گئے باورچی کا پیشہ کرتے ہوئے اور اب تک دیگچی میں

کفگیر چلانا نہ آیا۔“

اس کی جو شامت آئی تو کھراٹھا۔

”حضور پھر اور کیسے بھولوں۔؟“

یہ سننا تھا کہ بھال صاحب کی تابلیت میں ایک اُبال آگیا

اور باورچی کو گوشت بھوننے کا سبق پڑھانے کے لئے صرف ایک

سلیپر پہنے ہوئے باورچی خانے میں پہنچ گئے اور باورچی کے



ہاتھ سے کفگیر لیتے ہوتے بولے۔

”دیکھو اس طرح بھوتے ہیں۔“

اور دیگچی اور کفگیر سے مندر کا گھنٹہ بجانا شروع کر دیا۔  
 باورچی ہاتھ باندھے دُور کھڑا تھا اور بھائی صاحب پورے  
 بوش و خروش کے ساتھ ناؤ کھینے کی طرح گوشت بھون رہے  
 تھے کہ یکایک دیگچی الٹ کر چولہے میں آ رہی اور چولہے کے اندر  
 آگ کے بجائے بوٹیاں نظر آنے لگیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ بھائی صاحب  
 کو آج اپنی حماقت کا احساس ہو گا مگر انہوں نے تو تہر آلود  
 نگاہوں سے باورچی کو گھورا اور کفگیر ہٹخ کر بولے۔

”اب تم کو چولہا بنانا بھی میں ہی سکھاؤں کہ چولہا کس طرح  
 بنایا جاتا ہے۔ یہ آپ نے چولہا بنایا ہے۔ جس پر دیگچی بھی نہ ٹکے  
 بیوقوف۔ نالائق، گدھا، چلا ہے وہاں سے باورچی کی دُمن بنے۔“  
 یہ کہتے ہوئے بھائی صاحب تو کمرے میں آ گئے اور ہم کو  
 یہ فکر ہوئی کہ اب کیا کھائیں گے؟

ہم تھے بیمار اور علاج تھا ڈاکٹر انصاری کا کہیں ایک دن  
 بھائی مقصور نے ہم کو دوا پیتے دیکھ لیا۔  
 کہنے لگے۔

”کیا پل رہے ہو؟“  
عرض کیا۔

”دوا۔“

حیرت سے بولے۔

”خیریت تو ہے؟“

ہم نے عرض کیا۔

”تم کو معلوم نہیں میں کس قدر بیمار ہوں۔“  
کہنے لگے۔

”یہ تو معلوم ہے مگر یہ دوا کس کی ہے۔“  
ہم نے کہا۔

”ڈاکٹر انصاری کی۔“

بھال صاحب نے یہ سنتے ہی کچھ اس طرح منہ بنایا

گویا ہم محنت جو توف ہیں۔  
کہنے لگے۔

”یہ ڈاکٹر انصاری کی دوا پیتا کیا محنت؟“

ہم نے جمل کر کہا۔

”نہیں تو کیا تمہارا علاج کروں؟“



نہایت سنجیدگی کے ساتھ زور دالہجے میں فرمایا۔

”خیر میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ

ان ڈاکٹر انصاری صاحب سے اچھی ہی دوا بخو نیز کروں گا ان کے علاج

سے بھلا کیا فائدہ ہو گا۔ اس سے تو مہاتما گاندھی کا علاج کرتے۔“

ہم نے حیرت سے پوچھا۔

”مہاتما گاندھی کا علاج؟“

کہنے لگے۔

”اور کیا اگر کسی ماہر طب کا علاج کرنا ہے تو کسی باتا عدہ حکیم

یا ڈاکٹر کا علاج کرو۔ بیچارے ڈاکٹر انصاری کو تو اب طب یاد بھی

نہ رہی ہوگی۔ وہ تو سیاست کے پیچھے سب کچھ بھول گئے۔ ان کا

علاج تو واقعی ایسا ہے جیسے کوئی عقل کا دشمن گاندھی جی یا پنڈت

جواہر لال نہرو کا علاج شروع کر دے۔“

ہم نے کہا

”تو پھر کس کی دوا پیوں؟“

کہنے لگے

”میاں تمہارا مرض بھی کوئی مرض ہے۔ معمولی سی کھانسی

ہے اور بخار۔ تم تو میرا ایک چپکلا استعمال کر رکہ دو لوں وقت کھانا

کھانے کے بعد لیموں کا شربت پی لیا کرو، اور یہ جو چوہلے کی مٹی ہوتی ہے نا اس میں تھوڑا سا سیاہ نمک ملا کر دن میں چار یا پنج مرتبہ چاٹ لیا کرو بس۔“

بتائیے کہ ان حضرات کے مشوروں پر عمل کرنے والا کتنے دن زندہ رہ سکتا تھا، خیر یہ تمام باتیں تو اس لئے قابل برداشت تھیں کہ ان کا تعلق محض ان کے مشوروں سے تھا ہمارے عمل سے نہ تھا۔ لیکن ان میں ایک مرض یہ بھی تو تھا کہ ان کو مختلف قسم کے درد سے اٹھا کرتے تھے مثلاً کھانا پکانے کا درد کہ بیٹھے بٹھائے ہی ذہن میں آگیا کہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا زیادہ پر لطف ہے۔ ممکن ہے ان کے لئے پر لطف ہوتا ہو مگر ہمارے لئے تو ایک مصیبت ہوتا تھا۔ ایک دن صبر کیا۔ دو دن صبر کیا آخر ہم نے ان سے کہا۔

”یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟“

کہنے لگے

”بھائی اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ بس دست خود دیاں خود اور واقعی جو مزہ اس میں آتا ہے کسی بات میں نہیں آتا، اپنی مرضی کا کھانا انسان خود ہی بہتہ پکا سکتا ہے۔“

ہم نے کہا۔



تو پھر ہم اپنے لئے انتظام کریں۔  
کہنے لگے

”انتظام کیا کرو گے۔ آخر میں تو پکاتا ہی ہوں۔“

ہم نے صاف گوئی سے کام لے کر کہا۔

”بھائی صاحب ہم کو تو آپ معاف ہی رکھیں۔ ہم سے یہ

جیل خانے والا کھانا نہیں کھایا جاتا۔“

لاپڑا ہی سے بولے۔

”تو تم خود پکالیا کرو۔“

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”نا بابا۔ یہ میرے پس کاروگ نہیں۔“

شفقت آمیز انداز سے فرمایا

”انسان کو ہر کام کرنا چاہیئے۔“

اب مجھ ہی کو دیکھو میں کسی کا محتاج نہیں رہ سکتا یہ نہیں

کہ ایک وقت ملازم نہیں تو بھوکا پڑا رہوں۔“

ہم نے کہا۔

”تو بھائی جب تم کو آتا ہے تو اس فن کو اسی دن کے لئے اکٹھا

رکھو جب ملازم نہ ہو۔ یہ کیا کہ ملازم بھی ہے اور کھانا بھی خود پکا

رہے ہیں۔“

فیصلہ کن جواب دیتے ہوئے کہا

”تم کو اگر پسند نہیں ہے تو تم اپنا کھانا ملازم سے  
چکوا لیا کرو۔ میں تو عہد کر چکا ہوں کہ دستِ خود وہاں خود“  
مختص یہ کہ ہمارا کھانا باورچی پکانے لگا اور بھالی مقصود  
اپنا کھانا خود پکاتے رہے، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد بھالی مقصود  
کا عہد بھی باورچی ہی کو نبھانا پڑا۔

ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے آخر ان سے کہہ ہی دیا۔

”کیوں جناب وہ عہد کیا ہوا؟“

ہنس کر کہنے لگے

”ہر کسے را بہر کارے ساختند“

ایک مرتبہ سائیکل سے ہولی نفرت اور ان کو سواری کا شوق  
پہرایا چنانچہ سائیکل تو ہولی نیلام اور ایک میلے سے جا کر ٹوٹا خرید  
لاتے۔ جس پر بیٹھ کر بھیک مانگنے کے انداز سے سواری شروع  
کر دی گئی مگر تھوڑے دنوں میں وہ ٹوٹو بھی نخاس کی ہوا کھاتا ہوا  
نظر آیا۔ اور پھر سیکنڈ ہینڈ سائیکل کی تلاش شروع ہو گئی۔ اسی طرح  
موسیقی کے شوق نے ایسا گدگدایا کہ ہارمونیم خرید لائے اور مجھ پر



زور پڑنے لگا کہ طلبہ کی جوڑی خرید کر طائفہ مکمل کر دوں مگر میں ابھی  
 اس حماقت کو سمجھنے کی کوشش ہی کرتا رہا کہ وہاں موسیقی سے  
 طبیعت سیر ہو گئی اور ہارمونیم بیچ کر نیلامی بندوق خرید لی گئی اور  
 اب شرکار کے فوائد پر روز لکچر سناتے جانے لگے اور بھالی مقصود  
 اچھے خاصے شرکاری بن گئے۔ بندوق کے عروج کے بعد بھی زوال  
 کا زمانہ آیا، اور اس کی جگہ کیمرس نے لے لی، اب بھالی مقصود  
 فوٹو گرافر تھے، آرٹسٹ تھے اور دعویٰ یہ تھا کہ اس فن میں بڑے  
 بڑوں کو اکٹھا کر طاق پر بٹھا دیں گے۔ ابھی — کیمرس فروخت کرنے  
 کی نوبت نہ آئی تھی کہ آپ کو فلمی مصوری کا سودا ہوا، اور حیفنالی کو  
 نیچا دکھانے کی رات دن رہنے لگی۔ عجیب عجیب بے ڈول تصویریں دن  
 میں پچاسوں کی تعداد میں بنتی تھیں اور ہر تصویر کی ہم سے گالا گھونٹ  
 کر دالی جاتی تھی ہمارا کمرہ تھا کہ ان کے نزدیک نگار خانہ چین بنا  
 ہوا تھا اور ہمارے نزدیک آسیب خانہ والٹر رات کو وہی ڈراؤ لی  
 تصویریں خواب میں آ کر ہم کو پریشان کرتی تھیں۔ مگر بھالی مقصود  
 کسی طرح مانتے ہی نہ تھے۔ خیر خدا خدا کر کے یہ شوق بھی اپنی انتہا کو  
 پہنچ گیا، اور اب آپ کو شاعری کی سوچ بھی یہ بھی ہمارے لئے ایک  
 تربیت بخشی جب دیکھتے کچھ تازہ کلام ہمارا دماغ خراب کرنے کے

لے تیار ہے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت ہم کو وہ خرافات جو ہر انکار  
سناتے جاتے تھے بلکہ ہم کو دابھی دینا پڑتی تھی۔

شاعری کے بعد انشا پر داری کا دور شروع ہوا۔ اور اس میں بھی ہماری  
خوب خوب شامت آئی کہ بھائی مقصود ہیں کہ اپنا شیطان کی آنت کی طرح  
لمبا اور ہونٹ، امرود، اگرہ والے تک کا مضمون بنا رہے ہیں، اور ہم ہیں  
کہ در دسر کے مائے بیتاب دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے ان کا مضمون  
سن رہے ہیں پھر اس کے بعد یہ بھی پوچھا جاتا تھا کہ کہو اس مضمون سے بحال  
بچ جائے گی نا؟

ہمیں کہنا پڑتا تھا یقیناً۔

مختصر یہ کہ بھائی مقصود کی یہی حرکتیں تھیں جن کی وجہ سے پہلے تو کالج  
میں ان کا نام "یادداشت" رکھا گیا۔ پھر بھائی گڑبڑ "کہلائے گئے پھرستان"  
مشہور ہوئے۔ پھر "قوس و قزح" کہلائے جانے لگے۔ اور آخر میں "بہر و پیا"  
کا خطاب دیا گیا جو اس وقت بچہ بچہ کی زبان پر ہے حالانکہ کوئی ان کے  
سامنے کہہ دے تو وہ اب بھی اپنی اور کہنے والے کی جان ایک کر دیں۔



جب کالج میں داخلہ کے لئے بھالی مقصود تشریف لائے۔ تو بیدار  
 باریک انگری کے پیرکھنوں کی مشہور و معروف دوپلی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ پہریں  
 میں جالی کھلا ہوا چوڑی دار یا جامہ تھا اور ہاتھ میں چھتری لیکن جب داخلہ  
 کے بعد ان کو بورڈنگ میں رہنا پڑا اور ٹاپاں کی آب و ہوائ نے ایک طرف سے  
 اثر کیا اور دوسری طرف "مرزا ریشمی" کی بچھتی سے ناک میں دم ہوا تو آپ  
 نے ترک کی ٹوپی شیر والی یا ترکش کوٹ میں رہنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ  
 بورڈنگ کے تجربہ کار اور گھاگ طلباء میں آپ کا بھی شمار ہو گیا، لیکن ان  
 کی حالت میں صرف یہ نہیں تک تغیر نہیں ہوا کہ انگریز کھانچھوڑ کر ترکش کوٹ

پہنا اور روپی ٹوپی کی جگہ ترک ٹوپی استعمال کرنے لگے بلکہ ان پر تو کچھ صاحبیت  
 نا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ حد سے گزرنے لگے۔ مونچھیں چھوٹی ہونا  
 شروع ہوئیں، یہاں تک کہ آخر کار غائب ہو گئیں۔ حقہ کی جگہ سگریٹ نے  
 لے لی تھی مگر اب سگریٹ کی جگہ سگار اڑنے لگے۔ کوٹ اور پتلون ہوائے  
 گئے۔ ہیٹ خریدی گئی آنکھوں کے امتحان کی ضرورت محسوس ہوئی اور  
 چشمہ بھی لگ گیا۔ مختصر یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے مرزا ریشمی مکمل صاحب  
 بہادر بن کر رہ گئے اور اب ان کا مقابلہ بورڈنگ کا شاید کوئی طالب علم  
 بھی جہاں تک فیشن کا تعلق ہے نہیں کر سکتا تھا۔

ہم نے ان کے ذاتی معاملات میں کبھی دخل نہ دیا حالانکہ ہم کمرہ  
 ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہوتے کی حیثیت سے ہم بھائی صاحب کی خدمت میں  
 بہت بڑی حد تک گستاخ بھی تھے۔ لیکن ایک دن جب سوٹ اور بوٹ  
 سے لیس ہو کر بھائی صاحب سگار کا دھواں تمام کمرے میں فیاضی کے  
 ساتھ منتشر کر رہے تھے۔ اور شاید کہیں جانے کے لئے تیار تھے۔ ہم سے  
 نہ رہا گیا اور ہم نے کہہ ہی دیا۔

”مقصود یہ تو بتاؤ کہ کیا تمہارا تو می اور ملکی لباس اس قدر ناقص

ہے کہ تم غیروں کی وضع اختیار کرو۔“

مسکرائے اور بالکل نامیانہ انداز سے سگار کا دھواں چھوڑتے



ہوتے فرمایا۔ ”ہمارا ملکی اور قومی لباس؟ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا قومی اور ملکی لباس، ہاں وہ ناقص تو نہیں ہے مگر نامعقول سزا دے۔“ ہم نے اپنا غصہ پی کر کہا۔  
 ”وہ کیسے؟“

لبس بھالی مقصود پیٹ کی کریڑہ درست کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے اور سنگار نہ ہیں دبا کر خالص ولایتی لب و لہجے میں کہنے لگے ”اُس انگریزی لباس کو پہن کر تم جانتے ہو کیا محسوس ہوتا ہے؟“ ہم نے بات کاٹ کر کہا۔

”یہی کہ بندر کی طرح نقل اتار رہا ہے۔“  
 جھٹک کر بولے۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں تم خاموشی سے سنو کہ مقصود ایسا اٹھ نہیں ہے جس نے فضول یہ وضع اختیار کی ہوگی۔ تم کو دراصل معلوم ہی نہیں کہ انگریزی لباس میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں جس وقت انسان سوٹ پہن کر تیار ہو جاتا ہے اس کو خود بخود اپنے میں ایک مستعدی ایک ہمتی اور ایک جفاکشی کی طاقت محسوس ہوتی ہے اور وہ غیر محسوس طور پر زیادہ سے زیادہ کام انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ بہتر سے بہتر ہندوستانی لباس پہن کر بازاء میں نکلیں لیکن جو امتیاز ایک معمول سے دو کوشی کے

سوٹ کو حاصل ہو گا وہ آپ کے قیمتی بندرستانی لباس کو حاصل نہ ہوگا  
 آپ ریل میں سفر کیجئے اور سفر میں قیمتی بندرستانی لباس پہن لیجئے۔  
 مگر یہ دو کوڑھی کے قلی آپ کی ایک نشستیں گے اور جہاں کوئی بیٹ  
 والا ان کو نظر آئے گا بس نانی ہی مر جائے گی بات یہ ہے کہ اس  
 لباس میں کچھ خدا اور عیب ہوتا ہے اور بھائی ہیں تو یہ کہتا ہوں کہ  
 سوٹ پہن کر انسان خود اپنی نظروں میں با وقعت ہو جاتا ہے۔ دوسرا  
 کا تو ذکر ہی نہیں۔

ہم نے کہا،

ہاں یہ ایک بات تم نے کہی ہے کہ انسان خود اپنی نظر میں

با وقعت ہو جاتا ہے۔

کہنے لگے،

ہاں کبھی تم سوٹ پہن کر دیکھو تو سہی کہ تمہاری روح میں

کس قدر بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

غرض کیا،

اس خاکسار کو تو خیر بخش ہی دیجئے ابھی میرا نکمیر لفظ لفظ

جیانتا ہے۔

تجربہ سے پہنچے گئے۔

”کیا معنی ہے؟“

عرض کیا کہ ”معنی یہ کہ اگر ایک طرف میری روح میں پالیدگی پیدا ہو گئی تو دوسری طرف یہ بھی خیال پیدا ہو گا کہ مجھ کو دیکھنے والے کیا کہتے ہوں گے اور خود وہ لوگ جن کا ملکی اور قومی لباس سوٹ ہے میرے لئے کیا راستے قائم کریں گے۔“

ایک جاہل عارفانہ سے فرمایا۔

”میں نہیں سمجھا۔“

میں نے ذرا دتیک ہو کر کہا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ خود انگریز مجھ ہندوستانی کو انگریزی لباس میں دیکھ کر میری غلامانہ ذہنیت میری فتح نما شکست میسر کی ضروری اور میری کورانہ تقلید پر دل ہی دل میں ہنسیں گے۔“

غصے سے سُرُخ ہو کر اور دانت پیس کر بولے۔

”تم بھی سخت جاہل ہو، اس قدر بڑھ لکھ کر بھی تمہاری کھوپڑی میں گوبر بھرا ہوا ہے آخر میں پوچھتا ہوں کہ مہذب انگریز کسی ہندوستانی کو مہذب کی طرف آتا ہوا دیکھ کر کیوں ہنسنے لگے؟“

عرض کیا۔

”ہنسیں گے، اس لئے کہ انہوں نے آپ کے ملک میں آکر



اور آپ کے ملک میں رہ کر آپ کی وضع کبھی اختیار نہیں کی آپ  
 نے کبھی ان کو انگریزوں اور دوپٹی ٹوپی یا شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے  
 نہ دیکھا ہوگا لیکن آپ اپنے ہی ملک میں رہ کر صرف ان کو دیکھ  
 کر ان کا چہرہ اُتارتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں کہ اس میں تنہی کی  
 کونسی بات ہے۔

کچھ لا جواب سے ہو کر ادھر ادھر گردن کو جھٹکا دیا اور جواب  
 سوچنے کے لئے نہکتے ہوئے سگڑ کو ہلا کر بولے۔

”تم سے میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ہندوستانی لباس سخت  
 نامعقول ہوتا ہے۔ پھر بھلا انگریز اپنا معقول لباس چھوڑ کر تمہارا نامعقول  
 لباس کیوں پہنتے۔“  
 ہم نے کہا۔

”جس طرح بنسید ثبوت کے آپ ہندوستانی لباس کو نامعقول  
 کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح میں انگریزی لباس کو نامعقول کہتا  
 ہوں۔“

کہنے لگے

”اے ہندوستان لباس نامعقول ہے۔“  
 میں نے ترکیب ترک کی کہا۔

ہاں انگریزی لباس نامعقول ہے۔

عاجز آکر کہنے لگے۔

تو پھر یہ قضیہ طے ہی نہیں ہو سکتا اس بحث میں اُلجھنا

تفصیح اوقات ہے۔

کہنے لگے

میں پھر کہتا ہوں کہ انگریزی لباس کی معقولیت کو مندرجہ ذیل

لباس کی نامعقولیت سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

”اچھا السلام علیکم!“

ابھی دو چار ہی قدم گئے ہوں گے کہ واپس آکر کہنے لگے۔

ہاں ہیٹ کے فوائد ملاحظہ فرمائیے ٹوپی کی ٹوپی اور چھتری کی

چھتری۔

عرض کیا

”تو پھر سر پر چھتری ہی کیوں نہ پہنا کیجئے۔“

کہنے لگے

”تم تو خمبلی ہو، باتیں میں کہیں اس بزرگ آج کی فائدہ نہ جائے

نیشن اور انگریزیت کے مسائل میں بھال نہ کرو۔“

شدت پسندی صرف لباس ہی کی حد تک نہ رہی۔ بلکہ اب تو ان کی تمام تر کوششیں یہی تھیں کہ تمام انگریزی معاشرت کو کھول کر پلی جائیں، اور ہندوستانی طرز معاشرت جس طرح بھی ہو سکے جلد سے جلد چھوڑ دیں، چنانچہ اب بغیر میزا اور چھری کاٹنے کے کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ بغیر کموڈ کے قبض ہو جانا تھا۔ بغیر لیس ماٹ کے پیشاب کا ہونا ناممکن تھا اور بغیر ٹب کے غسل نہیں کر سکتے تھے ان سے ہم نے ان تمام چیزوں کے متعلق ایک ایک کر کے بحث کی، چھری کاٹنے سے کھانا کھانے کے متعلق انہوں نے کہا کہ ہاتھ سے چھو کر کھانا کھانے کے معنی یہ ہیں کہ نہ ہر کھانا چار ہا ہے۔ اس لئے کہ نو اسے ہیں ناخن کا مس ہونا ستمیت پیدا کر دیتا ہے۔ کموڈ کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس طرح رفع حاجت کرتے ہوئے بھی انسان شریف اور معزز معلوم ہوتا ہے اور یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کول گندی بات کر رہے ہیں۔ ٹب میں غسل کرنے کو انہوں نے بڑا نقطہ نظر سے مفید بتایا۔ مختصر یہ کہ ان کے پاس ہر بات کا ایک جواب تھا۔ اب وہ معقول ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی بحث نہیں بہر حال وہ سوائے اپنے چکرار سیاہ رنگ کے بال بال انگریز ہو چکے تھے۔ البتہ ان سے شرط صرف یہ تھی کہ جس



دن بھی انہوں نے فیشن کے جنون میں آکر سگ پرستی شروع کر لی۔ اسی دن سے وہ اپنے کمرے میں خوش اور ہم اپنے کمرے میں خوش نظر آئیں گے۔ اور انہوں نے ہم سے یہ اقرار کر لیا تھا کہ ہم ان کے ساتھ ہال میں ناچنے والیوں کے سامنے

ان کے ساتھ ہوٹل میں برج کیلئے والوں کے سامنے ان کے ساتھ دوسرے پیچھے اور کرائی دوستوں سامنے ان کے ہندوستان یا مسلمان ہونے یا نہ ہونے والی بحث کبھی شروع نہ کریں گے۔ ہم اپنے وعدے پر قائم تھے۔ حالانکہ جب یہ کیمپنٹ ڈینگ ہانگتا تھا تو نفس کشی ہی کرنا پڑتی تھی۔ اور وہ کہتے والے معاملے ہیں اپنے وعدہ پر قائم تھا حالانکہ بغیر کتے کے اس کا تمام فیشن اور تمام صاحبیت نامکمل تھی۔ غالباً یہی دو طرفہ رواداری تھی کہ ہم دونوں اس اجتماع ضدین کے بعد بھی۔ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔

لیکن جب بھانڈا پھوٹنے والا ہوتا ہے تو اس کے اثرات قدرتی طور پر خود بخود ہو جاتے ہیں ایک دن بھائی متھوڑہ بہت تھکے ہوئے اپنے نمائش دہی صاحب لوگ دوستوں میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگوان کے والد بزرگوار مع جتہ دوستار

لاکھی ٹیکتے ہوئے آپہرے چلے جہاں تک میرا خیال ہے بھائی مقصود  
 یہ طے کئے ہوئے تھے کہ جب گھر جائیں گے تو کچھ مونیچیں بڑھائیں  
 گئے اور وہ ہندوستانی نامقول لباس جو اب تک محفوظ تھا پہن کر  
 چلے جائیں گے لیکن اس ناگہانی طور پر والد ماجد کے پھٹ پڑنے  
 کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہم حیران و ششدر رہ گئے کہ اس  
 وقت بھائی مقصود کس منہ سے اپنے ہندوستانی باپ کے سامنے  
 آئیں گے نکر واللہ بھائی مقصود نے تو کمال ہی کر دیا کہ پہلے تو  
 نہایت گرمجوشی اور سعادت مندی کے ساتھ اپنے خالص سودشی  
 باپ سے ملے، پھر گھبراتے ہوئے میرے پاس آئے کہ سنو ایک  
 بات اور کان میں کہنے لگے۔

”دیکھو ایک بات کا خاص خیال رکھنا کہ میرے جو دوست آئے  
 ہوئے ہیں ان کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ یہ میرے باپ ہیں!“  
 میں نے برجستہ کہا۔

”اجی لا حول ولا قوۃ تم نے بھی مجھ کو کیا ترا بیوقوف سمجھا ہے  
 اول تو اس کا موقع ہی نہ آنے دوں گا کہ کوئی یہ سوال کرے اور  
 اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گا کہ مسٹر کے والد کے خانا ماں  
 ہیں۔“

ہنس کر کہنے لگے۔

”ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے۔“

”وہ تو کہے کہ کسی نے یہ سوال ہی نہیں کیا ورنہ ہم دانتی

ٹے کر چکے تھے کہ یہی جواب دیں گے کہ یہ حضرت مقصود کی

ماما کے خالسا ماں ہیں.....“



سینما جانے کا شوق ہم کو بھی ہے اور عام طور پر انگریزی  
 جاننے والے سینما سے دلچسپی لیتے ہیں لیکن بھالی مقصود کو شوق  
 نہیں بلکہ سینما سے عشق تھا چنانچہ آندھی آئے یا پانی برسے لیکن وہ  
 شام کو پکچر پلیس میں نظر آتے تھے اور دنیا کی کوئی بات ان کے  
 اس پروگرام میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی تھی لیکن ہم نے ان  
 کے اس پرچھائیوں والے عشق کو کبھی کوئی سنجیدہ صورت نہ دی  
 بلکہ ہم خود بہر نسیم تبدیل ہونے کے دن عام طور پر ان کے ساتھ  
 جایا کرتے تھے لیکن اب تو ان کے پاس سینما سے متعلق لٹریچر اور

علمی رسائل بھی آنا شروع ہو گئے جو غالباً انہوں نے خود منگوانا  
 شروع کئے ہوں گے۔ اور رفتہ رفتہ ان کے پاس صرف ایک  
 ہی دلچسپ مبحث رہ گیا تھا جو یہ تھا کہ ڈگلس فربنیکس میں کیا  
 کیا محاسن ہیں، اور کیا کیا معائب چارلی اور ہیرلڈ لائڈ کے مزاج  
 میں کیا فرق ہے مس سلوچنا اور مس کچن میں کیا خامیاں ہیں اور  
 خوان میں فلم اسٹار بننے کی صلاحیت کس قدر قدرتی طور پر  
 ٹھونس ٹھونس کر بھر گئی ہے۔ ہم کو ان باتوں سے دلچسپی تو نہ ہوتی  
 تھی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم الجھتے بھی نہ تھے مگر آپ ہی بتائیے  
 کہ جب ہر وقت ہمارا نامک میں دم کیا جاتے گا اور ہر وقت یہی ذکر  
 ہو گا تو پھر ہم بھی انسان ہیں فرشتہ نہیں، آخر کار سینما اور فلم  
 کا مبحث ہماری دیکھتی ہوئی رگ بن گیا۔ ان کو جس قدر اس ذکر  
 سے دلچسپی ہوتی تھی اسی قدر ہم کو وحشت، ان کو جس قدر شوق  
 بڑھ رہا تھا۔ اسی قدر ہماری نفرت ترقی کر رہی تھی یہاں تک  
 کہ اس خاص معاملہ میں ہماری اور ان کی حیثیت بالکل فریقین  
 مخالفت کی سی ہو گئی لیکن ہم کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے بھائی  
 مقصود اپنی لذت سے مجبور ہیں۔ اس میں غریب سینما یا بی بی  
 فلم کا کوئی اثر نہیں۔ ہم دیکھنے والے کا اگر ہمارے ہوجانا

تو آج یہ دنیا فلمستان یا کچر پریس نظر آتی اور ہر انسان فلم  
 اسٹار ہوتا لیکن ہم بھی سینما دیکھتے ہیں آپ بھی سینما دیکھتے ہو گے  
 خدا نہ کرے کسی کا حال بھائی مقصود کی طرح ہو جائے کہ لیٹے ہیں  
 تو تمام فلمی قابلیت صرف کر کے سونے کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔  
 بیٹھے ہیں تو کبھی مصنوعی تبسم چہرے پر پیدا کر رہے ہیں اور کبھی  
 نمائشی غصہ کو اصلی غصہ سے ملتا رہے ہیں۔ جلد و جہد ہو رہی ہے  
 کھڑے ہیں تو اپنے تیور سے بالکل روڈ الٹ والیٹون بن جاتے  
 ہیں کبھی اکڑ کر ڈگلس فربنیکس کو مات کراتے چل رہے ہیں تو  
 کبھی چارلی کی چال ہے تو کبھی ڈگلس کی چست بات کیجئے تو کبھی  
 ہیرلڈ کی طرح حماقت مآب چہرہ بنا کر سنتے ہیں۔ اور کبھی میری پکفورڈ  
 کی طرح ایک ادا سے دلبری ہے، مختصر یہ کہ اب وہ مجسم سینما ہو کر رہ  
 گئے تھے اور رہی سہی جو مقبولیت تھی وہ بھی تشریف لے جا چکی تھی  
 اس سے بات کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ کہ ہر بات کے جواب میں وہ  
 کوئی ایک ایکٹ کا ڈرامہ دکھا دیتے تھے اور ان کی حرکتوں سے  
 اس لئے کوفت ہوتی تھی کہ وہ سوتے جا گئے اٹھتے بیٹھتے کسی وقت  
 بھی اپنے سینما پر سے باز نہیں آتے تھے کوئی اور نہ ہوتا  
 کے سامنے ایکٹنگ ہوتی تھی غسل خانہ میں جا کر تھوکتے تھے



کھیلنے میں فلم والی تھراپٹ موجود ہوتی تھی کھانے کی میز پر ہر لمحہ  
باقاعدہ ایکٹنگ کے ساتھ منہ میں جاتا رہیں یہ سمجھ لیجئے کہ وہ انسان  
تو واجبی طور پر رہ گئے تھے البتہ فلم بن گئے تھے اور صرف ان ہی  
میں تمام مشہور فلم اسٹارز کا لطف آتا تھا۔

ہم کو سب سے زیادہ کوفت اس وقت ہوتی تھی جب ہم اور  
وہ پہلو بہ پہلو سینما ہال میں بیٹھ کر کوئی فلم دیکھتے تھے اس وقت  
ہم تو تماشا دیکھنا چاہتے تھے ڈرامہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے  
تھے اور خاموشی کے ساتھ اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے  
تھے مگر بھالی مقصود عین اسی وقت اپنے فلمی تجربہ کا سکہ بھانا چاہتے  
تھے۔ اور بات بات پر وہ طویل طویل تبصرہ اور تنقید کرتے تھے  
کہ خدا جانے ان کے اسی تبصرہ میں ڈرامہ کہاں سے کہاں پہنچ  
کر کم سے کم ہمارے لئے تو خبطا ہی ہو جاتا تھا۔ ہم پہلے تو مروت  
برتتے تھے پھر شرانت سے ان کو خاموش رہنے کے لئے کہتے  
تھے اور آخر میں لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تھی مگر وہ صرف  
تھوڑی دیر کے لئے ہماری اس بد مذاقی سے بالوکسی ہو کر چیپ  
ہو جاتے تھے اور پھر وہی دخل در معقولات مختصر یہ کہ ان کے ساتھ  
سبنا جانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا اور یہ صرف ہم ہی تھے کہ

معاملہ رفع دفع ہو جاتا تھا۔ ورنہ اور کوئی ہوتا تو فوجدار ہی ہو جاتی  
 کتنا دلچسپ منظر تھا کہ جولیٹ اپنے بالاخانہ پر کھڑی ہوئی  
 رو میو میں کھوئی ہوئی تھی اور رو میو صحن کے باغ میں دیپکے کے نیچے  
 کھڑا ہوا اپنے کو جولیٹ میں ڈھونڈ رہا تھا اور دونوں طرف سے  
 انتہائی رومانی پیام ایک دوسرے کو پہنچاتے جا رہے تھے کہ  
 بھائی مقصود نے میرا شانہ پکڑ کر بلایا اور کہنے لگے۔  
 ”دیکھا کیسی زبردست ٹٹو کر کھائی ہے۔“  
 میں فلم میں غرق تھا، بالکل عالم خواب کی طرح کہہ دیا۔

”ہوں۔“

کہنے لگے۔

”اس قسم کی لغزشوں سے پوری فلم تباہ ہو جاتی ہے۔ دیکھ  
 رہے ہو تم کہ انگریزی نہیں بھی بعض اوقات کس قدر ناقص ہوتی  
 ہیں۔“

میں نے فلم پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ہو گا بھئی۔“

کہنے لگے

”اچھی کہی آپ نے ہو گا بھئی، ارے سہی! انگریزی۔“

ہیں تم سمجھتے بھی نہ ہو گے کہ قلم ڈارکٹر صاحب کیا حماقت کر گئے  
ہیں۔“

ہم نے پھر عالم مدہوشی میں کہا۔

”ہوں۔“

کہنے لگے

”بات یہ ہے۔“

ہم نے کہا

”اچھا خیر فلم دیکھو۔“

ہمارا شانہ ہلا کر اور گردن زبردستی اپنی طرف پھیر کر بولے  
”ان حضرت نے لغویت یہ کی ہے کہ جولیٹ کو تو دکھایا ہے کوٹھے  
کے اوپر اور رومیو کو دکھایا ہے کوٹھے کے نیچے باغ میں لیکن  
منظر ایسا ہے کہ دونوں کو ایک ہی سطح پر ہونا چاہیے تھا۔“

میں نے غصے سے کہا

”پھر میں کیا کروں؟“

لیکن اب جو فلم دیکھتا ہوں تو وہاں تلوار چل رہی کتنی خدا  
جائے اتنی دیر میں جانے کیا کیا ہو گیا جی میں آیا کہ بھائی مقصود کا  
منہ نوج لوں کہ عین اسی وقت ان حضرت کو پھر شانہ ہلانے کی

ضرورت پیش آگئی۔ کہنے لگے۔

”یہ دیکھتے تلوار کی جنگ میں بھلا کشتی کا کونسا ٹمک ہے؟“  
میں نے ڈانٹ کر کہا۔

”پھر آپ کا احبارہ؟“

کہنے لگے

”احبارہ تو خیر کچھ نہیں ہے۔ مگر تمہیں خدا کی قسم بتاؤ تو کہ  
اس میں کشتی کا کونسا ٹمک تھا؟“

اب میں نے فلم کو توجہ نہیں میں ڈال دیا اور اس ظالم بھائی  
مقصود کی طرف متوجہ ہو کر جس قدر گالیاں یا دتئیں سب ایک زبان  
میں دے ڈالیں۔ اور ان سے قطعی طور پر کہہ دیا کہ اگر تم نے اپنی اس  
حرکت کو نہ چھوڑا تو میں ابھی چلا جاؤں گا اور آئندہ کبھی تمہارے  
ساتھ اس طرح وقت برباد کرنے اور روپیہ ضائع کرتے نہ آؤں گا۔  
لیکن اب جو اسکرین کی طرف دیکھتا ہوں تو ایک چڑیا چوچ میس  
”انٹروں“ لئے کھڑی تھی جی چاہتا تھا کہ بھائی مقصود کی اور اپنی  
جان ایک کردوں لیکن وہ اب میرے غصے کو سمجھ کر چپ تھے۔  
اور تمام درمیانی وقفہ میں پھولے رہے حالانکہ اس وقفہ میں ان  
کو اختیار تھا کہ ول کھول کر تنقید کرتے جس طرح جی چاہے تبصرہ



کرتے اور جس قدر دل چاہتا جتے لیکن ہم نے بھی ان کو شانے کی  
کوشش نہ کی اس لیے کہ پھر وہ باقی نصف بھی دیکھنے نہ دیتے۔  
انٹروال کے ختم ہونے کے بعد ہم دونوں اس طرح اپنی اپنی جگہ پر  
آکر بیٹھ گئے کہ

تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں  
اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ فلم دیکھتے رہے لیکن  
بھائی مقصود اپنی عادت سے عجیب رہتے، بار بار پہلو بدل رہے  
تھے اور ان کا دل بیتاب تھا کہ کسی طرح رائے زنی شروع کر دیں  
لیکن چونکہ ہم سے لڑائی ہو چکی تھی، لہذا ہم سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے  
البتہ خود ہی کبھی تو مضحکہ خیز ہنسی ہنستے تھے کبھی خود ہی "لاحول ولاقوة"  
کہتے اور کبھی "بھش" کہہ کر ناک پھول چڑھا لیتے تھے۔ آخر ان سے  
نہ ربا گیا اور ایک موقع پر بے اختیار ہو کر کہنے لگے۔

"تم پھر کہو گے کہ میں بولتا ہوں مگر واللہ دیکھو تو یہ گدھا پن  
یہ لوگ فلم بناتے ہیں یا گھاس کھودتے ہیں۔" مجھ کو بھی ہنسی آگئی  
اور میں نے ہنس کر نہایت خوشامد سے ہاتھ جوڑ کر کہا "اللہ اب  
آجی ہی فلم دیکھ لینے دو۔"  
کہنے لگے

”میں فلم دیکھنے کو تھوڑی سی منع کرتا ہوں، مگر ہاں یہ باتیں بھی  
نوٹ کرتے جاؤ۔“

میں نے ان کو مطمئن کرنے کے لئے کہا،

”میں سب کر رہا ہوں۔“ اور پھر تماشا دیکھنے میں مصروف  
ہو گیا کہ انہوں نے مجھ کو جھنجھوڑ کر نہایت جوش سے فرمایا۔

”بھئی واللہ کمال کر دیا۔ واہ واہ، سبحان اللہ یہ کام صرف  
ایک انگریز یا امریکن ایکٹر ہی کر سکتا تھا۔ سمجھو تم، اس ظالم نے  
کیا کمال دکھایا ہے۔“

میں نے لاپرواہی سے کہا،

”ہوسٹل چل کر سمجھیں گے۔“

سینہ پر ہاتھ رکھ کر گردن کو فلما نہ ادا سے جنبش دے کر

بولے:

”بہت اچھا سرکار، آپ تو خفا ہی ہوئے جاتے ہیں سینما

کیا دیکھتے ہیں کہ گہ ہالڈ سے مرے جاتے ہیں، میرا تو یہ مقصد ہے

کہ اگر تم نے دام خراب کئے ہیں اور وقت برباد کیا ہے۔ تو کچھ حال

بھی کر لو تم نہیں چاہتے تو جانے دو، مابخیر و شما بسلامت۔“

میں چپ رہا کہ اس وقت ان کا اس طرح روٹھ جانا میرے

حق میں اچھا ہو گا اور واقعی ان کے روٹھے رہنے سے ایک قسم  
 کا سکون بھی تھا کہ پوری توجہ کے ساتھ مشغول دیکھ رہا تھا گو کہ بھائی  
 مقصود اس ڈرامہ کو میرے لئے ہلنا چکے تھے مگر چونکہ میں یہ  
 ڈرامہ بڑھ چکا تھا۔ لہذا جو مناظر دیکھنے سے رہ گئے تھے ان  
 کا سلسلہ یاد کر کے ملا لیا تھا اور اب فلم میری سمجھ میں آرہی تھی  
 کہ یکا یک بھائی مقصود کی برہمی ختم ہو گئی اور آپ پورے جوش و  
 خروش کے ساتھ مجھ پر چھاپہ مار کر بولے ۔  
 ”دیکھا تم نے۔“

میں نے بجائے ان کو جواب دینے کے اپنی ٹوپی اٹھائی اور  
 کھٹ پٹ کرتا ہوا سینا بال سے باہر نکل آیا مقصود منہ کھولے  
 اور آنکھیں پھاڑے ہوئے اپنی سیٹ پر ہی رہ گئے۔  
 ہم ہوسٹل پہنچ کر بار بار کان پکڑ کر تو بہ کر چکے تھے کہ  
 اب کبھی اس خطی کے ساتھ سینما نہ جائیں گے، اور چار پائی پر لیٹے  
 ہوئے آج کی تفریح اوقات پر خود ہی جل رہے تھے کہ سامنے سے  
 بھائی مقصود اپنی ٹائٹ کیپ ہاتھ میں لئے ہوئے شرایوں کی  
 ڈنگمائی ہوئی چال میں آئے نظر آئے اور یکا یک مجھ کو دیکھتے  
 ہی ان کی چال چارلی چپلن والی ہو گئی ان کو دیکھتے ہی منہ ہی آگئی مگر

میں نے ان پر غصہ کا اظہار کرنے کے لئے اپنی ہنسی ضبط کر لی اور خاموش پڑا رہا۔ انہوں نے کمرے میں آکر پہلے تو ڈگلس کی طرح اپنی ٹوپی دُور ہی سے کھونٹی کی طرف پھینکی جو بجائے کھونٹی کے زمین پر گر کر تھوڑی سی پھولدار ہو گئی پھر بیکن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ممتہ سے سیٹی بجانے لگے۔ اس وقت وہ بالکل متحرک تصویر بنے ہوئے تھے میں خاموش تھا بلکہ ان کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا مگر انہوں نے خود ہی ٹپ سے کہا۔

”تم بھلی عجیب اہمق ہو۔“

میں نے غصے سے جواب دیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں۔“

کہنے لگے

”اوہو، طرہ یہ کہ آپ خفا ہیں؟“

میں نے کہا

”نہیں، میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ آئندہ آپ کے ساتھ

سینما نہ جاؤں گا۔“

کہنے لگے

اچھا تو اپنے ساتھ مجھ کو لے جایا کر ٹاپے لڑا ایک ہی بات ہے



میں نے کہا۔

”میں سلسلہ کو سنجیدگی کے ساتھ ختم کر چکا ہوں اور اب  
اس بحث پر کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔“

کہنے لگے

”تمہاری یہ خفگی بالکل احمقانہ ہے۔ اور قصہ صرف یہ  
ہے کہ تم کو جولیٹ کا پارٹ کر نے والی ایکٹریس نے اکی قدر  
مسحور کر لیا ہے کہ تم میری مخالفت نہ کر سکتے لیکن میں تم کو  
بتانا چاہتا ہوں کہ جولیٹ کے پارٹ میں بہت سی خامیاں  
تھیں اول تو.....“

میں فلسفہ کی ایک کتاب کے صفحہ ۳۱۵ کی گیارہویں سطر  
پر تھا کہ آئسبرج کو بھائی مقصود کے لکچر کی آواز دبانے کے  
لئے با آواز بلند کتاب پڑھنا پڑی اور میں اپنے مقصد میں  
کامیاب بھی ہو گیا، اس لئے کہ بھائی مقصود بھی جھک مار کر چپ  
ہو گئے مگر وہ دن اور آج کا دن کہ ہم دونوں کبھی ساتھ ساتھ  
سینما نہیں گئے بلکہ اگر کسی دن وہ سینما ہال میں نظر آجاتے  
تھے تو میں دور پیچ کالکٹ لئے، موسے چار آنے والے  
درجے میں ڈر کے مارے گھس جاتا تھا۔ مجھ کو دراصل.....

”چوٹی والوں کی تالیاں اور سیٹیاں گوارا تھیں مگر ان  
حضرت کی بکواس سے تو میری روح ہی کا پتی تھی۔

تعطیلات کلاں کے بعد کالج کا پہلا دن بارکل روز محشر کا نمونہ  
 ہوتا ہے کہ ہر ایک نفسی نفسی پکارتا پھرتا ہے لیکن اللہ رے عشق  
 صادق کہ اس دن بھی ہم اپنے بچڑے دوست مقصود کے لئے  
 دیوانہ وار ہر طرف آنکھیں پھاڑے اور آغوش شوق وا کئے ہوتے  
 پھر رہے تھے کہ وہ مل جائے تو اس کو آنکھوں میں بٹھالیں اور کایچ  
 سچے پٹاکہ دل میں رکھ لیں، لیکن اس صبر آزما کا کہیں پتہ نہ تھا۔  
 ہمارا شوق اور تمام جوش و خروش و شش یاس اور ناامیدی کی صورت  
 میں تبدیل ہو جاتا تھا کہ یکایک ہم کے دھماکے کی طرح "السلام علیکم"

کہہ کر وہ ہم سے لپٹ گیا، ہم نے حیرت سے کہا،  
"مقصود؟"

کہنے لگے

"اچھے تو رہے، ویسے بہت ہو گئے ہو۔"

ہم نے کہا

"یہ کیا؟"

کہنے لگے

"یہ الحمد للہ کہ ڈاڑھی ہے۔"

ہم نے ان کی سرسید نما ڈاڑھی کو دیکھ کر کہا۔

"ڈاڑھی تو ہے، مگر یہ کیسے؟"

ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اور اس کو بیڑ کی طرح مٹھیا کر کہنے

لگے۔

"کیوں کیا بڑی معلوم ہوتی ہے؟"

ہم نے کہا۔

"بڑی یا اچھی کا سوال نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ اصل ہے یا

خسریہ لی ہے؟"

سنجیدگی سے ہنس کر فرمایا۔



”ارے یار سہنے بھی دو اس غریب کو تم یہ بتاؤ کہ چٹیاں  
کیسی گزریں؟“

میں نے مہر ہو کر کہا  
”یہ تو سب بتائیں گے۔ پہلے اس ڈاڑھی کا حدود اربعہ، وجہ  
تسمیہ اور مقام وقوع وغیرہ سب کچھ ایک سرے سے بتا چلو۔“  
آپ نے اپنی کھیتی پر ہاتھ پھیرا اور ایک فخر کے انداز میں  
بولے۔

”بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ یہ ڈاڑھی سہے ظاہر ہے کہ میں  
نے رکھی ہوگی۔ اب یہ سوال ہے کہ کیوں رکھی۔ تو اس کا جواب یہ  
ہے کہ میں ایک مرد مسلمان ہوں میرا فرض ہے کہ شریعت اسلامی  
کی پابندی کرتے ہوئے ڈاڑھی رکھوں۔ چنانچہ میں نے الحمد للہ کہ  
اس فرض کو محسوس کیا اور ڈاڑھی رکھ لی بس۔“  
میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”ہاں صاحب خدا جس کو توفیق دے۔ وہی تمہاری طرح  
ہو سکتا ہے۔“

آپ نے انکساری کے ساتھ ڈاڑھی پر دست شفقت پھیرتے  
ہوئے گردن جھکالی۔

تھوڑی سی دیر میں بھائی مقصود کی ڈاڑھی کی خبر برقی لہر  
 کی طرح تمام ہوسٹل میں پھیل گئی اور ہوسٹل کے تمام لڑکے  
 اس عجیب و غریب چیز کو دیکھنے کے شوق میں ہمارے کمرے  
 کے اندر اور باہر جمع ہو گئے۔ بیچ میں وہ بزرگ ترین ہستی تشریف  
 فرماتھی جس کو سب بھائی مقصود کہتے ہیں، اور چاروں طرف  
 ان کے معتقدین کا ہجوم تھا ایک نے کہا،  
 ”ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔“

دوسرا لہلا۔

”بڑی مشکل سے ایک روپیہ میں ملی ہے۔“

تیسرے نے کہا۔

”بارش کے زمانے میں آرام رہے گا۔“

ایک اور آواز آئی۔

”خضاب کے بکس پر آپ کی تصویر دیکھی تھی۔“

کسی اور نے کہا۔

”ہم سب کو آج ہی آپ کے دست مبارک پر بیٹ کرنا

چاہیے۔“

کوئی اور بولا۔

”اس کی کٹائی کا ٹھیکہ بیلام ہونے والا ہے۔“

اب بھائی مقصود سے ضبط نہ ہو سکا، آپ نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھا کر غضب ناک نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر غصہ سے ہٹکاتے ہوئے فرمایا۔

”آپ لوگوں کو شرم تو نہیں آتی اپنے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے۔ اگر اپنے دین و ایمان کی پرواہ نہیں ہے تو کم سے کم دوسرے کے مذہبی جذبات کا خیال کیجئے یہ مضحکہ میرا نہیں ہے، بلکہ مذہب کا مضحکہ ہے۔ خدا اور رسول سے دل لگی ہے۔“

اس غضب ناک تقریر کے جواب میں ایک گونج جانے والے قہقہہ کی آواز بلند ہوئی اور بھائی مقصود کا چہرہ کوہِ آتش فشاں بن گیا۔ انہوں نے منہ سے بھاگ اڑاتے ہوئے کہا،

”ڈاڑھی اور مونچھ منڈا کر زنانی صورت بنانے والے، مردوں کا مذاق اڑاتے ہوئے، کس قدر اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔“

تمام کمرہ قہقہوں سے ہل گیا۔ مگر بھائی مقصود دیکھ کر راگ کی طرح اپنی آتش بار تقریر فرما رہے تھے۔

”ڈاڑھی کا مضحکہ اور یہ زنانوں کا منہ لا حول و لا قوۃ، خدا

کے نور کی توہین اور یہ مسلمانوں کے بچے۔ استغفر اللہ.....  
 شریعت اسلام کا مذاق اور یہ نام نہاد مسلمان خود بالہ  
 معلوم ہوا کہ قہقہے کمرہ کی چھت لے اڑے اور بھائی مقصود کی ڈاڑھی  
 خود بخود کاٹنے لگی انہوں نے گرج کر کہا۔

”میں اس دل آزار مذاق کے لئے تیار نہیں ہوں اور اگر  
 آپ لوگ نہ مانے تو مجھ کو.....“

”ڈاڑھی منڈوا دیتا پڑے گی۔“

ایک آواز۔

”ڈاڑھی کون مونڈے گا۔ دیکھوں تو اس بڑے کی صورت“

بھائی مقصود نے اچک کر کہا۔

آواز آئی۔

”ناٹ، حجام، سیفی ریزر۔“

بھائی مقصود کا تمام جسم تھر تھرا ہوا تھا اور شدت غیظ سے

الفاظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے، آپ نے ڈاڑھی کو

نوچنے کے انداز سے اپنے پنجے میں لے کر کہا۔ ”بد تمیز..... بالالائق“

کہیں کے..... لونڈے ہیں کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں.....

بیہودہ نہیں تو..... اچھا آپ لوگ اس کمرے سے نکل جاتیں



حکیتِ آدٹ۔

شہاب نے کہا۔

”آخر اس میں بگڑنے کی کونسی بات ہے؟“

”بگڑنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سب جان اللہ یعنی ڈاڑھی کی کھلی

توہین ہو اور کوئی بگڑے بھی نہیں۔“

بھائی مقصود نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

شہاب نے ان کو چپکارتے ہوئے کہا۔

”ارے میاں آپس میں اس قسم کے مذاق ہوا ہی کرتے ہیں

تم ڈاڑھی نہیں چھپے لگا لو۔ مگر ہمارے لئے وہی مقصود ہو گئے جو

ہمیشہ تھے۔“

کہنے لگے

”جی نہیں۔ میں ڈاڑھی کے معاملے میں بالکل مذاق پسند

نہیں کرتا یہ مذہبی معاملہ ہے۔“

میں نے کہا۔

”واقعی آپ لوگ اس مذاق کو ختم کر دیں اس لئے کہ ہمارے

مولانا اس معاملہ میں حد سے زیادہ سنجیدہ ہیں اور یہ مذاق سنجیدہ

ہو گیا تو اچھا نہ ہو گا۔“

بھالی مقصود نے کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

”آ... آ... آخر میں پو... پو... پوچھتا ہوں کہ کہ... کہ کیا یہی اک

مذاق رہ گیا ہے۔ تو میں ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں میں باز آپا مذاق سے۔“

اس وقت تو خیر سب ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے،

لیکن اب بھالی مقصود کی ڈاڑھی ایک مستقل لطیفہ تھی اور یہ ناممکن

کہ کوئی ان کو دیکھ کر ڈاڑھی پر بے ساختہ ہنس نہ دے اور ایک

فقہ نہ کہے، قدم قدم پر بھالی مقصود سے جنگ ہوتی تھی، اور

ہر ہر منٹ پر کوئی نہ کوئی ان کی ڈاڑھی سے الجھ کر ان کے عتاب کا

شکار ہوتا تھا۔ ہوسٹل سے کالج تک اور طالب علموں سے لے

کر پروفیسروں تک حلقے میں ہر جگہ بھالی مقصود کی ڈاڑھی کی دھوم

تھی اور یہاں ان کی ڈاڑھی روزانہ ترقی کے ساتھ پھیلتی

جاتی تھی کالج کے میگزین میں ”چور کی ڈاڑھی میں تنکا“ کے عنوان

سے کسی نے ایک مضمون بھی لکھ مارا، جو بقول بھالی مقصود کے

براہ راست ان ہی سے تعلق رکھتا تھا اور اگر وہ چاہتے تو مقدمہ

چلا کر مضمون نگار سے لے کر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، بلکہ میگزین بحق۔

ملک معظم یا کم سے کم بحق ریش مقصود ضبط ہو سکتا مگر ہم لوگوں کے

سمجھانے کی وجہ سے بھال مقصود خاموش رہے لیکن باتیں اٹاکے بھی  
 ضبط سے باہر تھیں کہ جب کلاس میں جاسے تو ان کی تصویر مع ڈاڑھی  
 کے بلیک بورڈ پر موجود، لہڑکے تو لڑکے استادوں کا یہ حال تھا  
 کہ جب کبھی بھالی مقصود کو شرمندہ کرتا چاہتے تھے تو ہمیشہ  
 یہی کہتے تھے ”آپ اپنی حرکتوں کو دیکھئے اور اس ڈاڑھی کو“  
 یونین کے جلسوں میں جب کبھی بھالی مقصود پہنچ جاتے تھے تو  
 سب تالیاں بجا کر اور کھڑے ہو کر آپ کا استقبال کرتے تھے۔  
 اور اس وقت تک ریشا تیل، ریشا تیل کے لہڑے بلند ہوتے جتے  
 تھے جب تک کہ ”آرڈر آرڈر“ کے لہڑے مع ہاتھوں کے بلند ہو کر  
 ان لہڑوں کو دبا نہیں دیتے تھے پھر اس پر طرہ بھالی مقصود کا  
 غصہ تھا مختصر یہ کہ ایک عجیب ہنگامہ تھا جو بھالی مقصود کی ڈاڑھی  
 نے ہر طرف برپا کر رکھا تھا اور سچ پوچھتے تو اس بھالی مقصود کا  
 بھی ناک میں دم تھا، کبھی تو وہ ارادہ کرتے تھے کہ اب پڑھنا  
 دھنا چھوڑ کر فقیری لے لیں، کبھی ان کا دل چاہتا تھا کہ اس کالج  
 ہی کو چھوڑ دیں جس میں اس قدر نامعقول طالب علم بھرے ہوئے  
 ہیں، اور غالباً کبھی کبھی وہ یہ سوچتے بھی ہوں گے کہ اس اپنے  
 ہاتھ کے لٹکائے ہوئے پودے یعنی ڈاڑھی کو جو اپنے پورے

شباب پر پہنچ کر لہرار ہی کتنی بھڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔  
 لیکن کچھ تو وضعداری کا پاس تھا اور کچھ ڈاڑھی کی (یعنی) اپنے کئے  
 کی شرم کہ وہ برابر ڈاڑھی سے نباہ کر رہے تھے۔ ان کا اندازہ آپ  
 کو بھی ہو گیا ہو گا۔ لیکن صبر کی ایک حد ہوتی ہے۔ اور جب صبر آزما  
 حالات حد سے گذر جاتے ہیں تو مضبوط سے مضبوط گیر کٹر کا انسان  
 متزلزل ہو جاتا ہے۔ یہی حال بھائی مقصود کا ہو گیا تھا کہ ایک طرف  
 تو ڈاڑھی کے خلاف ایچی ٹیشن کا نہایت مردانگی سے مقابلہ کر رہے  
 ہیں اور دوسری طرف ان کو ہر وقت یہ فکر تھی کہ آخر ہو گا کیا؟  
 ہم کو ان کی بدحواسی کا اندازہ تھا۔ لیکن چونکہ وہ اپنی بدحواسی  
 کو ہم سے بھی چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لہذا ہم کو بھی اس  
 معاملہ میں خاموش ہی رہنا چاہیے تھا، اور ہم واقعی خاموشی کے  
 ساتھ اس وقت کے منتظر تھے جب بھائی مقصود کے صبر کا پیرالہ  
 چھلک جائے۔ اور آخر کار وہ وقت آ ہی گیا، اور ایک دن رات  
 کو ایک بچے کے قریب بھائی مقصود نے ہم کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

”کیا سو رہے ہو؟“

میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے کوئی چور رہے۔“

چلے سے کہنے لگے۔

”نہیں مجھ کو کچھ باتیں کرنا ہیں۔“

بہت ضروری، بالکل پرائیویٹ اور خاص قسم کی۔

میں نے جما ہی لیتے ہوئے کہا۔

”غیر آپ..... بسم اللہ۔“

کہنے لگے۔

”میرا تو ناطقہ بند کر رکھا ہے۔“

میں نے کہا۔

”ایک فلٹ کی پچکاری لے آؤ۔ بغیر اس کے مجھ میں گے نہیں۔ اور ان کمبختوں سے تو ناطقہ ہی نہیں بند ہے بلکہ ہر وقت میرا کا بھی اندیشہ ہے۔ جس طرح تم اب جاگ اٹھے ہو ابھی کچھ دیر پہلے میں بھی جاگ رہا تھا۔“

جھڑک کر بولے۔

”میں کچھ کہہ رہا ہوں آپ کچھ سمجھ رہے ہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کالج کے لٹڈوں نے اچھا ناک میں دم کر رکھا ہے اور اب تو پروفیسر صاحبان بھی میری زندگی دشوار کئے ہوئے ہیں۔ ہر وقت ڈاڑھی کا طعنہ ہر وقت ڈاڑھی پر کھبتیاں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں



آتا کہ کیا کروں۔ کالج چھوڑ دوں تعلیم کو جہنم میں ڈالوں، ڈاڑھ سی  
سے ہاتھ دھو لوں آخر کیا کروں، عقل کام نہیں دیتی، تم ہی  
کچھ بتاؤ۔

میں نے کہا۔

”انا للہ وانا لہ راجعون۔ اسے ظالم اتنی سی بات کے لئے تم  
نے میری نیند حرام کر دی میں تو یہ سمجھا تھا کہ کوئی ڈاکہ پڑا ہے یا  
کوئی قتل ہو گیا ہے یا زلزلہ آیا ہے۔“  
تجب سے کہنے لگے۔

”اور یہ معاملہ کوئی معمولی ہے۔ آپ پر یہ مصیبت گزر رہی  
ہوتی تو آپ اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ میں چاہتا  
ہوں کہ خدا کے لئے کوئی فیصلہ کن راتے دو تاکہ میں اس  
مصیبت سے نجات پاؤں۔“

میں نے انگریز الٹ لیتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو صبح تک آنکھیں بند کر کے غور کرنے کا موقع دو“

پھر کچھ مشورہ دیں گے۔

کہنے لگے۔

”واللہ میں چار پائی الٹ دوں گا اور خدا کی قسم سونے

”نہ دوں گا ورنہ کوئی راستے دو۔“

”میں نے جلدی سے کہا۔

”اچھا تو ڈاڑھی.....“

بات کاٹ کر بولے۔

”کیا کہا۔ ڈاڑھی صاف کرادوں؟ ناممکن ہے۔“

میں نے کہا۔

”تو پھر صبح کچھ اور بتاتیں گے اس وقت یہی ایک ترکیب

فہم میں آئی تھی۔“

بھائی مقصود نے خلافِ عادت اس وقت معقولیت

سے کام لیا، اور اپنی چار پالی پر جا کر لیٹ رہے اور ہم ادھر

آنکھیں بند کر کے یہ جا اور وہ جا۔

صبح اُٹھے تو بھائی مقصود غسلِ خانہ میں ڈنٹر پھیل رہے تھے

ہماری آواز سننے ہی پر آمید ہو گئے، ہم نے ان کو دیکھتے ہی

بے ساختگی سے چیخ کر کہا۔

”ایں۔“

وہ ایک باتھ میں ڈاڑھی لئے ہوئے اور دوسرا ہاتھ

اپنے صاف کٹور پر پھیر رہے تھے، ہم اس طرح آنکھیں پٹاڑے

ہوتے ان کو دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے ڈاڑھ والے ہاتھ  
کو بلند کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا خون کالج والوں کی گردن پر ہے اور تم بھی ان  
میں شامل ہو۔“

میں نے حیرت سے کہا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“

ڈاڑھی کی لاش بے کفن کو حیرت سے دیکھ کر بولے۔

”جو کچھ تم لوگوں نے چاہا وہ ہو گیا۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہوا۔“

میں نے کہا۔

”اب تو اور بھی مذاق اڑائے گا۔“

غصہ سے سرخ ہو کر بولے۔

”اچھا مذاق ہے کہ نہ مرتے چین نہ جیتے چین، اب اگر مذاق

ہو تو جانتے ہو کہ میں کبھی پٹھان ہوں۔ اور میرے بھی جسم میں خون ہے

اور اس خون میں افغانی جوش موجود ہے۔“

میں نے کہا۔

”خاں صاحب یہ تو شیخ بے ملگرا.....“

کہنے لگے۔

اب اگر مگر کچھ نہیں جو تم نے رات کو مشورہ دیا تھا  
اور جو تم سب کا متفقہ مطالبہ تھا وہ بھی ہو گیا۔

ہیں واقعی بُت بنا کھڑا تھا اور مجھ کو آنکھوں سے دیکھنے  
کے باوجود یقین نہ آتا تھا کہ بھالی مقصود کی ڈاڑھی اس طرح  
خواب و خیال ہو گئی۔ بھالی مقصود مرحومہ کو مٹھی میں لئے ہوئے  
حسرت سے دیکھ دیکھ کر سہلا رہے تھے کہ اس حادثہ کی اطلاع  
ہوسٹل بھر میں پہنچ گئی اور جو شخص جس طرح بیٹھا ہوا تھا اسی  
طرح کمرے میں شریک غم ہو گیا۔ اس دن بھالی مقصود سے ہر  
جو چوتھیں چلی ہیں ان کا ذکر کرنا ہی فضول ہے لیکن شام تک  
ہوسٹل کے نصف طلباء نے سیاہ رتے بازوؤں میں لگا کر ڈاڑھی  
کے غم میں ایک جلسہ تعزیت منعقد کر دیا جس میں بھالی مقصود  
سے اظہارِ ہمدردی کیا گیا اور ڈاڑھی کی مغفرت کے لئے دُعا  
لیکن ان دونوں جلسوں سے بھالی مقصود اس قدر متاثر ہوئے  
کہ دوسرے ہی دن سے چھٹی لے کر اپنے حجرے میں مسکین  
ہوئے اور چھٹی کے بعد حجرہ اعلیٰ کمان سے نکلے ہیں تو ان  
کا غم البدل ان کے چہرہ پر موجود تھا۔

ڈاکٹر انصاری کی تقریر کا سب سے زیادہ اثر بھائی مقصود  
 پر ہوا کہ ہم لوگ "ہائیں ہائیں" کرتے رہ گئے اور وہ تیر کی طرح  
 ایٹچ پر پہنچ کر ٹوپی، شیر والی، کڑیا وغیرہ اتار اتار کر پھینکنے لگے  
 اور ایک گھڑی کی تہ بند باندھ کر پا جامہ بھی فوراً اتار کر پھینک دیا  
 اور لیٹے کہ مردہ بدیسی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں  
 نے ایک خاص جذبے کے ماتحت نہایت موثر تقریر کی تھی جس کا  
 صرف یہ حصہ ہم نے سنا، اور وقت بھی یاد تھا اور اب بھی یاد ہے۔  
 "ہیں صرف کالج کے طالب علموں کے لیے ایک نمونہ بنا ہوں



وہ مجھ کو دیکھ کر سبق (درس عبرت) لیں اور سودیشی کی ترویج میں  
اپنے فرائض کو محسوس کریں۔

اس واقعہ کے بعد سے بھائی مقصود ایک عذابِ الہی تھے  
جو کالج پر عموماً ہوسٹل پر خصوصاً اور ہم پر خاص الخاص طریقہ پر  
نازل کیا گیا ہو۔ ہر وقت یہی سودیشی اور بدیشی کا جھگڑا تھا اور وہ  
کسی وقت بھی کھڑکے پر چار سے باز نہیں آتے تھے ان کو سب  
سے زیادہ شکایت اس خاکسار سے تھی کہ ہر وقت کی نصیحت کے  
باوجود ہم اب تک کھڑ پوش کیوں نہ ہوتے تھے اور ہمارے لئے  
یہ نصیحت تھی کہ اب اگر ہم خود بھی بدیشی کے مقابلے میں سودیشی  
کے حامی ہو جاتے ہیں تو محض اس لئے کھڑ وغیرہ نہیں پہن سکتے  
تھے کہ بھائی مقصود پہن رہے تھے اور ان کے پہن لینے کے بعد  
جو شخص بھی کھڑ پہنتا اس کو دنیا تو خیر جو کچھ سمجھتی نہ سمجھتی بس کہ  
بھائی مقصود اپنا براہِ راست چیلہ ضرور سمجھ لیتے اور گاندھی جی کی  
معاہدہ میں منہ دیکھ دیکھ کر رہ جاتے وہ کھڑ پر چار محض اسی وجہ  
سے کر رہے تھے کہ کم سے کم اسی معاہدہ میں اولیت کا سہرا ان  
کے سر رہے اور باقی تمام ہوسٹل والے ان کے ہم جماعت طالب علم  
ان کو اپنا قائد اعظم سمجھ لیں ورنہ کیا وجہ تھی کہ وہ کپڑوں کی طرح

یہ چاہتے تھے کہ اگر خود کبڑے ہو گئے ہیں تو اپنے تمام ساتھیوں کو کبڑا کر دیں۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو لیکن وہ ایک نہایت سرگرم قومی آدمی بن گئے تھے۔ اور یہ تو خیر وقت کی بات ہے ورنہ سچ پوچھتے تو ان کو کانگریس کا صدر ہونا چاہیے تھا مقامی کانگریس کمیٹی کا صدر نہیں کمیٹی کے صدر منتخب ہونے کا حق اب براہ راست بھائی مسعود کو پہنچ رہا تھا۔ اور واقعی یہ ان کا ایشیا تھا کہ وہ اپنے ہوتے ہوئے ہندو جو اہر لال نہرو، سردار ولیم بھائی پٹیل ڈاکٹر انصاری، مسز سرد جی ناہیدو وغیرہ کو صدر ہوتا ہوا دیکھتے تھے اور چیپ تھے۔

ان کے اس قومی امنہاک کا یہ عالم تھا کہ پہنے تو خدا جاسے وہ صبح اٹھ کر کلمہ پڑھتے بھی تھے یا نہیں لیکن اب تو آنکھ کھلتے ہی "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتے تھے اور اس کے بعد ہی ضرورت سے فارغ ہو کر بھائے نماز پڑھنے یا مطالعہ کرنے کے پر خہ حاکم بیٹھ جاتے تھے۔ اور اس سودیشی عبادت میں دوپہر کر دیتے تھے اس کے بعد کلیجہ پر پتھر رکھ کر بقول خود تفسیع اوقات کے لئے کالج جاتے تھے۔ اور وہاں تمام وقت اسی سودیشی پرچار میں صرف کرتے تھے کہ جب دیکھتے دس یا بیس لڑکوں کے غول میں کھڑے ہوتے

حصول سوراخ کے امکانات پر لکچر دے رہے ہیں یا کسی ولایتی کپڑا پہننے والے طالب علم کو برا بھلا کہہ رہے ہیں کالج سے واپسی پر نہ ہی چرخہ والا وظیفہ اور رات کو سودیشی تقریروں سے ہمارے دماغ کو ترہنہ بنانے کی کوشش رات کو سونے کے بعد کا ہم کو کچھ علم نہیں، البتہ خیال یہی ہے کہ اپنی صدارت کانگریس کے خواب دیکھتے ہوں گے۔

ہم کو بھالی مقصود سے زیادہ اپنے اوپر تعجب تھا کہ ہم بھالی مقصود کے حالات کے ماتحت اب تک کس طرح زندہ تھے۔ حالات یہ تھے کہ نہ وہ ظالم خود پڑھتا تھا نہ ہم کو پڑھنے دیتا تھا، نہ خود اس کو چرخہ کے علاوہ کسی مشغلہ سے دلچسپی تھی نہ ہم کو دلچسپی لینے دیتا تھا۔ بس ان کا تو دل یہی چاہتا تھا کہ ہم بھی ان کی نقل مطابق اصل بن کر ان کی طرح کہیں کے بھی نہ رہیں۔ کتاب لے کر بیٹھے تو انہوں نے چرخہ چلاتے ہوئے کہا،

”کیا پڑھ رہے ہو؟“

ہم نے کہا

”ہاں پھر؟“

طنز کے ساتھ ہنس کر فرمایا۔

”کچھ نہیں، مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ آخر اس ناقص تعلیم کا کیا نتیجہ ہے۔“

”میں نے اس سمندر کی طرح طویل بحث کو کوزہ میں بند کر کے کہا۔ ”امتحان قریب ہے۔“  
کہنے لگے۔

”بفرض محال آپ امتحان میں کامیاب بھی ہو گئے تو کیا کیجئے گا۔“  
میں نے کہا۔

”ڈپٹی کلکٹری اور اس کے بعد اپنے اجلاس سے تم کو زیر دفعہ ۱۷۱ (الف) قانون ترمیم فوجداری ۶ ماہ قید سخت اور سو روپیہ جرمانہ یا عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ۳ ماہ قید مزید کی سزا دوں گا۔“

سنجیدگی سے کہنے لگے۔

”تم کو اپنے ان الفاظ پر شرم سے ڈوب مرنے چاہیئے اور مجھ کو فخر کرنا چاہیئے کہ میں مادرِ وطن کی خدمت میں جیل جاؤں گا اور ملک و قوم کے لئے قید و بند کے مصائب برداشت کروں گا۔“  
میں نے کہا۔

”تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کالج میں کیوں وقت برباد کر رہے ہیں، گانا دیکھی جی کے آئٹم میں جا کر چرخہ چلائیے یا تارڑی کی دکان پر دھڑنا دے کر مزے سے جیل جا بیٹے۔“

کہنے لگے:

”سچ کہتے ہو مگر میں اپنے والدین کو ابھی ہموار نہیں کر سکا ہوں اور یقین جانو کہ جس دن میں اپنے والدین کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا اسی دن میدان میں آکر تم کو دکھا دوں گا کہ وطن کے خادم اور آزادی کے شہید الٹی دنیا کے تمام مصائب کو کھیل سمجھتے ہیں۔“

میں نے عاجزی سے کہا:

”تو بھائی کم سے کم اس وقت تک تو مجھ کو بھی آزادی سے بڑھ لینے دو تمہارے والدین تو شاید تمہارے سمجھانے سے سمجھ بھی جائیں لیکن میرے والدین تو کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ اگر میں فیمل ہو گیا تو گھری سے نکال دیں گے۔ اور پھر میں کہیں کا بھی نہ رہوں گا۔“

کہنے لگے:

”نہیں تو تم کو پڑھنے کے لئے بالکل منع نہیں کرتا۔“

یہ کہہ کر وہ تو چرخہ چلانے لگے اور میں نے پڑھنا شروع



کر دیا۔ ابھی ایک صفحہ بھی مشکل سے پڑھا ہو گا کہ آپ نے کتاب شروع  
کر دیا۔

چرخہ کا تو بیڑا پار ہے۔

ہاں گوشتیاں — چرخہ

میں نے کتاب اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور اس خیال  
سے کمرے سے باہر نکل گیا کہ اسی وقت کسی دوسرے کمرے میں  
رہنے کا انتظام کر دوں گا، ہوسٹل کے تمام لڑکے کتابیں چاٹنے  
میں مصروف تھے اور میں تھا کہ خانہ بدوشوں کی طرح گوشہ امن  
کی جستجو میں ادھر ادھر مارا پھرتا تھا، یہ قیمتی وقت یہ نازک  
موقع، یہ امتحان کی گھڑیاں اور اس زمانے میں اس نظام بھالی  
مقصود کے یہ منظم، دل چاہتا تھا کہ اس موذی کو گولی مار کر پھانسی  
پر چڑھ جائیں یا خودکشی کر لیں ہم کو کون اپنے کمرے میں جگہ دیتا  
اور کس کی شامت آئی تھی کہ وہ ہمارے بجائے بھالی مقصود کے  
ساتھ رہنے پر تیار ہو جاتا۔

مختصر یہ کہ اس معاملہ میں کسی نے بھی ہمارے

غظیم الشان اشارہ نہ کیا۔ البتہ شاہد نے صرف اس قدر

بھالی مقصود کو سمجھائیں گے اور سمجھانے گئے تو

گرفتار ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔  
 ”یہ کیا واہیات ہے۔“

جواب میں بھالی مقصود نے اپنی شروع کر دی۔  
 ”یہ تو خیر سب کچھ واہیات ہے لیکن آپ کو شرم آنی چاہیے  
 آپ ولایتی کپڑا پہن کر اپنے ملک کو خود غلامی کی زنجیروں میں  
 جکڑ رہے ہیں۔“

شاہد نے کہا۔

”بھال میں تو ولایتی نہیں دیسی کپڑا پہنے ہوئے ہوں۔“  
 کہنے لگے

”یہ کچھ نہیں ہاتھ کا کاٹنا اور ہاتھ کا بٹنا ہوا ہونا چاہیے۔“  
 شاہد کے منہ سے نکل گیا کہ مانو یا نہ مانو میں تو کہوں گا کہ یہ  
 تمہاری شدت پسندی ہے۔

اس کے جواب میں بھالی مقصود نے وہ پرجوش اور دھواں  
 دھار تقریر کی کہ اس پاس کے کمروں سے تمام لڑکے نکل کر ہمارے  
 کمرے میں جمع ہو گئے اور ان کو دیکھ کر بھالی مقصود نے اور بھی  
 پرجوش تقریر شروع کر دی یہاں تک کہ آخر کار سب کو طے کرنا  
 پڑا کہ آج ہی سہ پہر کو ہوسٹل میں ایک جلسہ کیا جائے جس میں بھالی مقصود

سودیشی کے فوائد پر تقریر کریں یہ تجویز سنجیدگاہ کے ساتھ پیش کی  
 گئی تھی لہذا تھوڑے بہت انکسار کے بعد بھائی صاحب موصوف  
 تیار ہو گئے اور رٹکوں نے اپنا مطالعہ چھوڑ کر جلسہ کی تیاریاں  
 شروع کر دیں ہوسٹل کے تمام طالب علموں کو اطلاع کی گئی جب گاہ  
 بنایا گیا صدر کا نام تجویز ہوا اور تمام انتظامات سہ پہر تک مکمل  
 ہو گئے اور ادھر بھائی مقصود بھی کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔  
 مختصر یہ کہ مقررہ وقت پر جلسہ گاہ میں جب حاضرین جمع  
 ہو گئے تو بھائی مقصود کو بلایا گیا جو اپنے موٹے سے کتدر کے لباس  
 میں چپل پہنے ہوئے رئیس الاسرار یا شرمیان بلکہ تمام مہاتما بنے  
 ہوئے جلسہ گاہ میں پہنچے اور ان کے پہنچتے ہی تمام حاضرین جلسہ  
 نے خوش ہو کر اللہ اکبر، مولانا مقصود زندہ باد، مہاتما مقصود سرنگوں  
 باد، ٹوڈی بچے ہاتے ہاتے کے فلک فرکات نعروں سے آپ کا  
 خیر مقدم کیا۔ اور آپ تمام حاضرین کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے  
 ہوئے ایسٹج پر پہنچ گئے سب سے پہلے شاہد نے کھڑے ہو کر  
 کے لئے میرا نام پیش کیا جس کی تائید محمود اور اقبال نے کی۔  
 خود میں نے ایسٹج پر پہنچ کر اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔  
 نے ایک زرتار ہار بھائی مقصود کو اور ایک پھولوں کو۔

جس کے بعد تالیوں سے جلد کاہ گونج اٹھی۔

میں نے سب سے پہلے کھڑے ہو کر معزز مقرر کا تعارف  
حاضرین سے کرایا اور اس کے بعد اللہ اکبر، ٹو دی بچے ہائے ہائے،  
بھائی مقصود کی جے زندہ باد بندے ماترم، انقلاب زندہ باد،  
مولانا مقصود کی جے کے نعرے اور تالیوں کی گونج کے درمیان  
بھائی مقصود اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑے ہوئے  
اور جب حاضرین کا جوش عقیدت سکون پذیر ہوا تو آپ نے کلاماً  
کرتے ہوئے کھٹکھٹایا کر فرمایا۔

”معزز حاضرین و جناب صدر!

اس سے قبل کہ میں اصل موضوع پر کچھ کہوں مجھ کو آپ حضرات  
کا ممنون ہونا چاہیئے کہ آپ نے مجھ ایسے ہیچداں کو یہ عزت بخشی  
جے اور میں آپ کی اس اسپرٹ کی داد دیتے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ  
نے اس قسم کی تقریر کی ضرورت محسوس کی۔ آپ کے اس احساس سے  
مجھ کو یہ بھی امید ہے کہ آپ میں وہ احساس بھی جلد تر پیدا ہو جائے  
گا جو آپ کو ملک و قوم کے لئے مفید بنا سکے اور آپ وطن کی خدمت  
کے لئے میدان عمل میں آئیں گے، رہ گیا میں تو میرا یہی

مقصد ہے۔

شعلہ آہ سے اک آگ لگانا ہے مجھے  
خود بھی جلتا ہوں قفس کو بھی جلانا ہے مجھے  
واہ واہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ، کے نعرے، لیکن  
میں آپ حضرات سے بھی یہی کہتا ہوں کہ

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا  
کچھ کر لو جو انوں کی کھیتی جو انیاں ہیں  
خوب بہت خوب، مکرر ارشاد کے نعرے ”آپ جو ان ہیں  
ملک کا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ ہی کو ملک کی آزادی کے  
لطف اٹھانے ہیں۔ اور آپ ہی اپنے وطن کو غلامی کی زنجیروں سے  
آزاد کرائیں گے مجھ کو معلوم ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ طالب علم  
ہیں اور آپ اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ کوئی عمل خدمت  
انجام نہیں دے سکتے لیکن میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ ملک  
بنائیں یا پکٹنگ کریں یا جوس کی قیادت کریں یا جلسوں میں تقریریں  
کریں یا گرفتار ہو جائیں یا جیل چلے جائیں، بلکہ میں آپ سے صرف  
ایک خدمت وطن کے لئے استدعا کرتا ہوں جس کو آپ تعلیم کے  
ساتھ ساتھ انجام دے سکتے ہیں اور وہ خدمت صرف یہ ہے کہ  
پیشی اشیاء کا استعمال ترک کر کے سودیشی اشیاء کا استعمال



شروع کر دیں اور اسی طرح اپنی ملکی صنعت کو فروغ دیں (چیزز)  
 آپ کے جسم کھدّر کے عادی نہیں ہیں۔ آپ کے پیر چہل کے خوگر نہیں  
 ہیں۔ آپ سگریٹ اور سگار کی جگہ بیڑی نہیں پی سکتے۔

یہ سب کچھ صحیح ہے مگر کیا آپ اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے  
 اس قدر بھی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ یہ حقیر قربانی بھی نہیں کر سکتے تو۔

تغویر تو اسے چرخ نیلی لغو

(چیزز، چیزز، چیزز) آپ کو معلوم ہے کہ آپ کون ہیں —  
 (آواز جولاہے) ہاں بے شک جولاہے ہیں بلکہ جولاہے سے بھی بدتر۔  
 جولاہے کم سے کم اپنی ملکی صنعت کو توبر قرار رکھتے ہوتے ہیں  
 آپ تو یہ بھی نہ کر سکے یعنی

اسے روسیہ تھو سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

(چیزز) لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ جولاہوں پر اپنے بھائیوں  
 پر کس قدر ظلم ڈھارے ہیں؟ نہیں آپ کو نہیں معلوم آہ! اگر  
 آپ کو معلوم ہوتا تو آپ ہرگز یہ ظلم نہ کرتے کہ خود تو لنگاشتہ اور  
 مانچسٹر کے کپڑے استعمال کہہ کے ان کا رخاؤں کو اپنے روپیہ سے مالا مال  
 کر دیتے اور خود ہمارے پیارے بھائی جولاہے (قہقہہ) فاقوں  
 مرتے، افسوس افسوس ہمارے افسوس۔

سعدی از دست خوشین فریاد

اگر آپ ولایتی کپڑا نہ پہنیں تو آپ کو معلوم ہے کیا ہڈولایتی  
کارخانے لوٹ جائیں، ولایتی مزدور مرجائیں سرکاری کارخانے خالی  
ہو جائیں، برطانیہ میں قیامت آجائے حکومت فاقہ مست ہو جائے۔  
پارلیمنٹ کے ممبران در بدر بھگیک مانگتے پھریں، انگریزی سرمایہ داروں  
کا دیوالیہ نکل جائے اور خدا جانے کیا کیا ہو جائے۔

(چیز، اگر آپ صرف کھدر پہنتے اور میری طرح چرخہ چلاتے  
تو نہ گول میز کانفرنس کی ضرورت تھی اور نہ کسی تو تو ہیں میں کی۔ صرف  
یہی چرخہ اور کھدر سوراخ دلوادیتا۔ حالانکہ میں دعویٰ کر کے کہتا  
ہوں۔

(میز پر گھول نہ مار کر)

اور میرے یہ الفاظ اٹل ہیں۔

(استیثنا چڑھا کر)

کہ ہندوستان اب غلام نہیں رہ سکتا، اور اس کو میرے  
ایسے جانباز آزاد کر کے رہیں گے۔

(چیز اور تہقیر)

میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ حضرات کیوں ہنستے ہیں، کیا آپ کو

ہندوستان کی آزادی میں کوئی شک ہے؛

(آواز ہرگز نہیں، دیں سچے شک)

ہندوستان کی غلامی کا دور عالم نزع میں ہے اور... ہو سکتا

کے وارڈن صاحب نے عین اسی وقت نازل ہو کر سارا مزہ کر کے دیا

اور (آرڈر پلیر) کے لغزے نے جلسہ کو قبرستان بنا دیا۔ بھائی مقصود

کو تو معلوم ہوتا تھا کہ سانپ سونگے گا۔ لیکن جناب صدر یعنی یہ خاکسار

بھی کرسی صدارت کے نیچے ہی نظر آتا تھا، مگر خیریت یہ ہولی کہ وارڈن

صاحب اپنی نیکی یا عقلمندی سے جلسہ کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے ورنہ

اور آفت آتی۔

غالباً اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بھائی مقصود

امتحان میں بیٹھ کر شاندار نمبروں سے فیل ہوئے اور ہم کو اپنے اوپر

تعجب ہے کیونکہ رعایتی درجہ پاس کے۔

بہر حال بھائی مقصود کے جذبہ قومی یا جذبہ ناکامی نے ان کی

تعلیم چرخہ کی مذکور دی اور ظالم آسمان نے ان کو ہم سے چین کر چھڑا دیا

خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور وہ کہیں

بھائی مقصود جیسے کچھ بھی تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے  
 دم سے رولنگ ضرورتی اور ان کے کالج چھوڑنے کے بعد سے کالج  
 سے لے کر ہوسٹل تک ہر جگہ اُلو بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا نہ وہ چل  
 پہل تھی نہ وہ گرمی نہ وہ زندہ دلی باقی رہ گئی تھی اور نہ وہ دلچسپی  
 خصوصاً ہمارے لئے کالج بالکل ہی تاریک ہو گیا تھا کہ پڑھا لکھا  
 کھایا پیا اور منہ لپیٹ کر بیٹھ کر رہے۔ اب کس سے بات بات پر  
 اُٹھتے، کس کی باتوں سے بے ساختہ مینسی آتی، کس کی مونڈن کی ٹوٹ  
 کھاتے اور کس کو لیڈر بنا کر علیے منعقد کرتے معلوم یہ ہوتا تھا کہ

بھائی مقصود اپنے ساتھ ہی کالج کی زندگی بھی لیتے گئے ہیں، اور اب کالج سوائے مرگھٹ کے کچھ بھی نہیں ہے۔

بھائی مقصود سے خط و کتابت تھی اور ان کے خطوط ہی سے دلچسپی لی جاتی تھی کہ جب کبھی ان کا والد نامہ صادر ہوتا تھا تمام ہوسٹل کے طالب علموں کو یکجا کر کے سنایا جاتا تھا اور پھر سب ریزولوشن کی صورت میں متفقہ طور پر خط کا مضمون پاس کرتے تھے جو ان کو لکھا جاتا تھا۔

بھائی مقصود کے خطوط سے یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ وہ تجارت کی طرف رجوع ہو رہے ہیں۔ لیکن ابھی ہم یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ کیا کاروبار کرنے والے ہیں، اس لئے کہ کبھی وہ اپنے خط میں اسکیم مفصل اور واضح طور پر لکھتے تھے اور کبھی موثر سرورس کے تمام نشیب و فراز سے ان کا مکتوب گرامی بھرا ہوتا تھا ایک خط میں اینٹوں کے بھٹے کا کچھ ذکر تھا اور اس کے منافع کی حوصلہ افزا تفصیل لیکن آخری خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ ایک لیتھو پریس خرید رہے ہیں اور مطبع کھولنے کا ارادہ ہے۔ بہر حال ان تمام باتوں سے صرف یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ ان کا ارادہ ملازمت کا نہیں ہے اور وہ جو کچھ بھی کریں گے اس کا تعلق تجارت سے ہوگا۔ آخری خط میں انہوں نے



بڑے دن کی تعطیل میں اس خاکسار کو نہایت اصرار کے ساتھ موجود رہی  
کیا تھا لیکن ہم نے ان کو لکھ دیا تھا کہ وہ خود ہمارے گھر آئیں۔ اس  
لئے کہ بڑے دن کی تعطیل میں ہمارا گھر جانا ضروری ہے۔ بڑے بھائی  
کی شادی ہے اور اس تقریب میں آپ کو بھی جس طرح ممکن ہو شریک  
ہونا پڑے گا اسی بہانے سے ملاقات ہو جائے گی۔

بھائی مقصود کے اور ہمارے تعلقات ایسے نہ تھے کہ ہمارے  
بھائی کی شادی میں نہ آتے چنانچہ وہ آئے اور بیچ کثیت آئے ان  
کی تشریف آوری سے ہمارے خاندان کی جو کچھ عزت افزائی ہوئی اسکا  
تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں لیکن خود ہم کو جس قدر مستر ہوئی اس کا اندازہ  
خود نہیں کر سکتے۔

بھائی مقصود بالکل وہی تھے وہی ڈاڑھی وہی تیور وہی کھنڈر  
وہی چہل، لیکن سنجیدگی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور معلوم یہ  
ہوتا تھا کہ زمانے کے گرم و سرد نے ان کو کھٹوک پیٹ کر کچھ ہموار کر دیا  
ہے تمام دن ہم انتظامات میں ایسے مصروف رہے کہ ان سے بات  
کر کے کا موقع نہ ملا بات کی تو معلوم ہوا کہ اللہ اکبر یہ شخص کتنا بڑا تجارتنی انسان  
ہے ہم نے ان سے صرف یہ پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے کہ انہوں نے  
اپنی تمام اکیمیں اگل دیں منڈے سر پہ ہاتھ پھیر کر نہایت تجربہ کارانہ انداز

سے کہنے لگے۔

”میرا ارادہ تجارت کا ہے اور بھائی تم کو تو اندازہ ہوا ہی ہو گا کہ میں قدرتی طور پر تاجر واقع ہوا ہوں ہمیشہ سے میری طبیعت کو تجارت سے لگاؤ ہے لیکن میں تجارت کے معاملہ میں بہت بلند خیالات ہوں یہ نہیں کہ آٹے دال کی دکان رکھ کر بیٹھ گئے اور سمجھنے لگے کہ ہم تاجر ہیں دراصل یہ تجارت نہیں بلکہ تجارت کی توہین ہے۔ تجارت تو سلطنت کی تمہید ہوتی ہے اب تم خود ہی دیکھو کہ انگریزوں کی حکومت کی ابتدا کیسی تھی؟ یہی تجارت نہ؟ کہو! ہاں! تو بھائی میں تو تجارت اسی کو سمجھتا ہوں یہی وجہ ہے کہ اب تک میں کوئی کام شروع نہیں کر سکا تجویزیں ذہن میں آتی ہیں لیکن جب ان تجاویز کی تفصیل پر غور کرتا ہوں تو وہ ناقابل عمل بن کر جو صلی پست کر دیتی ہیں مثلاً تم ہی دیکھو کہ ابھی تین چار دن ہوئے ایک ترکیب بالکل الہامی طریقہ پر میرے ذہن میں آئی کہ ایک ایسی ایجنسی قائم کی جائے جس میں ملازمت دھونڈنے والوں کو ملازمت دلانے میں مدد دی جائے، اور ملازمت رکھنے والوں کو ملازم مہیا کرنے میں امداد، اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ ہم اشتہار دے دیں کہ ہم ضرورت مندوں کو ملازمت دلاتے ہیں اور بہترین ملازموں کا انتظام کرتے ہیں، اس اشتہار کا یہ نتیجہ ہو گا کہ ایک طرف تو

ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت کے متلاشی ہماری خدمت حاصل کریں گے، اور کسی کو چہرہ کی ضرورت ہوگی تو ہم سے کہے گا اگر کسی کو کلرک، مختار، خزانچی، ایڈیٹر، منیجر، ایجنٹ، سیکریٹری، ٹائپسٹ وغیرہ کی ضرورت ہوگی تو ہماری ہی خدمات حاصل کرے گا، اس میں ہمارا یہ فائدہ ہوگا کہ ہم دونوں سے کمیشن لیں گے، ایک سے ملازم دلوانے کا اور دوسرے کو..... ملازمت، حالانکہ ہم کو کچھ کرنا دھڑنا نہیں پڑے گا، دونوں کی درخواستیں ہمارے پاس موجود ہوں گی۔ بس سلسلہ ملانا ہمارا کام ہے۔ بتاؤ یہ کیسی لاجواب ترکیب ہے۔"

ہم نے اخلاقاً گردن ہلا کر تائید کی تو وہ اپنی چارپائی سے اُچک کر گویا ہم پر چڑھ بیٹھے اور ران پر ہاتھ مار کر کہنے لگے۔  
 "یاریہ تو ایسی ترکیب ہے کہ اگر اس کو ترقی دی گئی تو ہماری ایجنسی نہ صرف صوبہ کی بلکہ تمام ملک کا واحد ایجنسی ہوگی۔ پھر غیر مالک سے بھی تجارتی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔"

ہم نے کہا،

"تو پھر تم سوچتے کیا ہو، بسم اللہ کرو ترکیب تو اچھی ہے۔"  
 منہ ہڑحاکر کہنے لگے۔

”یہی تو تم سمجھ نہیں سکتے اور واقعی تم کیسے سمجھو تم کو تجارت کا کیا تجربہ ہے، اس کو میں ابی خوب جانتا ہوں، بات اصل میں یہ ہے کہ اس کے لئے ضرورت ہے مبلغ علیہ السلام اور وہ بھی اس قدر زیادہ کہ میں اگر سات مرتبہ بھی مرکب جیوں تو اس قدر روپیہ جمع نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا

”روپیہ کی ایسی کیا ضرورت ہے، یہ تو ایسا کام ہے جو فقیر روپیہ کے شروع ہو سکتا ہے۔“

تم نہیں جانتے اور واقعی تم کیا جانتے اس میں بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے، بات یہ ہے کہ پہلے تو مجھ کو تمام کثیر الاشاعت انگریزی اردو اور ہندی کے اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات دینا ہوں گے جن کے اخراجات ہزاروں تک پہنچیں گے پھر مجھ کو فی الحال کم سے کم یوپی کے بڑے بڑے شہروں میں شاخیں کھولنا پڑیں گی ہر شاخ میں ایک منجر، ایک کلرک اور ایک چہرہ اسی ہوگا۔ ان سب کی تنخواہیں اور مکانات کے کرائے اور دیگر اخراجات ملا کر یہ بھی چھ سات ہزار روپیہ ماہوار کا خرچ ہے۔“

میں نے کہا

’ہاں یہ تو ہے۔‘

کہنے لگے

’مگر ہے چلنے والی چیز اور اگر روپیہ ہو تو مال مال ہو سکتے ہیں۔‘

میں نے کہا

’بیشک۔‘

کہنے لگے

’تو اس لا جواب ترکیب کو محض روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے عمل

میں نہ لاسکے، اس کے بعد ایک اور تجویز ذہن میں آئی۔ یعنی ولایت

میں ہندوستان کا آم فروخت کیا جائے۔‘

میں نے کہا

’یہ تو واقعی بادشاہ بنادینے والی تجویز ہے۔ بس اپنے ہی تک

یہ تجویز رکھنا اور چپکے سے یہ کاروبار شروع کر دو۔‘ میں سب سمجھ گیا کہ

اس میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ اور کیا کیا انزاحیات اور کیا کیا منافع

ہوں گے۔‘

مجھ کو چپ کر کے بولے۔

’تم خاک بھی نہ سمجھو گے کہ میسر ذہن میں کیا ترکیب ہے

تم پہلے یہی بتاؤ کہ ہندوستان کا آم کس طرح لندن بچھ حالت میں



”پہنچا جاسکتا ہے؟“

”میں نے کہا“

”یہاں سے خام بھیجا جائے اور برف میں رکھ کر۔“

کہنے لگے

”ہشت کہیں اس طرح آم پہنچ سکتا ہے۔ اول تو خام

آم برف میں رکھے جانے کے بعد ٹھٹھکر کر رہ جائے گا اور سچے گا نہیں

دوسرے اگر پک بھی گیا تو وہ لطافت پیدا نہیں ہو سکتی جو قدرتی طور پر

آم میں ہوتی ہے۔“

میں نے کہا

”پھر کیا بذریعہ تار بھیج دے گے؟ یا لندن والوں کو لاسکی سے

کھلاؤ گے؟“

ہنس کر کہنے لگے

”تم تو مذاق کرتے ہو، خیر میں جو ترکیب تم کو بتانے والا

ہوں اسے سن کر اچھل ہی پڑو گے۔“

میں نے کہا۔

سنو بیانی میں بھی وہ ترکیب۔“

کہنے لگے۔

”آم ہندوستان سے ولایت بھیجے جائیں اور وہ صحیح حالت  
میں وہاں پہنچ جائیں اس کا صرف یہ طریقہ ہے کہ بذریعہ ہوائی جہاز  
بھیجے جائیں۔“

میں نے کہا۔

”واقعی ترکیب تو خوب نکالی۔“

کہنے لگے

”مگر سنو تو آپ اس کے اخراجات سن کر متہائے ہوش اُڑ  
جائیں گے۔ سب سے پہلے تو مجھ کو لکھنو، ملیح آباد، بنارس وغیرہ کے  
بہترین باغات خریدنا پڑیں گے پھر سب سے زیادہ ضروری بات یہ  
ہے کہ ہوائی جہاز ذاتی ہو بلکہ زیادہ اچھا تو یہ ہے کہ دو ہوائی جہاز  
ہوں ایک مال لے کر جائے اور دوسرا وہاں سے اُسے لے کر واپس  
آجائے اسب ذرا ہوائی جہازوں اور آم کے چند باغوں کے مصارف  
اور قیمتوں کا تخمینہ تو کرو۔“ میں نے کہا۔

”چھ سات ہزار یا اس سے کچھ زیادہ۔“

کہنے لگے

”چھ سات ہزار، اچھی چھ سات لاکھ کہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“

میں نے کہا۔

پھر؟

کہنے لگے

”پھر کیا؟ نہ چھ سات لاکھ کبھی ہوں گے نہ یہ اسٹیم لوپری ہوگی؟  
گھڑی سنے ٹن ٹن کر کے تین بجائے ہیں نے انگریز الی لے

کر کہا۔

”اچھا اب سو جاؤ صبح باتیں ہوں گی۔“

کہنے لگے

”بیٹھو تو ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔“ صرف دو گھنٹہ تو او

رات ہے، کیا کرو گے سو کر ایک ترکیب ایسی ہے کہ تم ہی داد دے

سکتے ہو۔“

میں نے جمایا ہی لیتے ہوئے کہا۔

وہ کیا؟

کہنے لگے

”وہی جو میں نے تم کو ایک مرتبہ لکھا تھا موٹر سروس کے

مستعلق اس کو خدا جانے تم نے کیا سمجھا تھا میرا مقصد یہ تھا کہ ان مقامات

پر موٹر سروس شروع کی جائے جہاں نہ ریل ہے نہ کوئی اور سواری

آسانی سے جاسکتی ہے۔ اس کے لئے ہم خود سڑکیں بنوائیں گے اور

ان سڑکوں پر اپنی لاریاں چلائیں۔ کے ہماری سروس تمام بندرستان  
میں ہوگی، لیکن اس کے اخراجات بھی ہوائی جہاز سے کم نہیں ہیں بلکہ  
زیادہ، یہی ہیں لہذا یہ اسکیم بھی ابھی تک محتاج عمل ہے۔  
میں نے کہا۔

”بھائی یہ تجویز تو کچھ نہیں۔“

سینے پر چڑھ کر بولے۔

”کیا کہا۔ یہ تجویز کچھ نہیں۔ کیا بتاؤں میرے پاس روپیہ نہیں  
ہے ورنہ تجویز کو عمل میں لا کر دکھا دیتا کہ کیسی ہے یہ تجویز۔“  
میں نے کہا۔

”نہیں بھائی میرے ذہن میں نہیں اتری ورنہ۔“  
کہتے لگے۔

”تم ان تجارتی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے مجھ کو تو تجربہ ہے اس لئے  
اس کو تو کچھ میں ہی خوب سمجھ سکتا ہوں اس میں ایک نکتہ اور بھی  
ہے کہ ہماری ہوائی سڑکوں کو کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا اور اگر  
استعمال کرے گا تو اس کو ٹیکس دینا ہوگا۔“  
میں نے کہا۔

”بھائی اب نیند کی وجہ سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔“

کہنے لگے۔

”تو یہ کیوں نہیں کہتے ہو، تم تو یہ کہہ رہے ہو کہ یہ تجویز ہی کچھ نہیں ہے اچھا جاڑ سو رہو پھر صبح اور تجویزیں بتائیں گے، حالانکہ اب سو کر اپنی طبیعت خراب کر دو گے۔“

اس وقت تو غیر نجات مل گئی لیکن دوسرے دن صبح سے لے کر شام تک اور شام کے بعد سے بھالی مقصود کی ٹرین کے وقت تک بیس اپنی کاروباری اسکیمیں بتاتے رہے لیکن ہر تجویز ایسی تھی کہ اگر اس کو ملک معظم بطور کاروبار عمل میں لانا چاہیں تو شاید کامیاب ہو جائیں ہم ایسے فاقہ مست تو کبھی قیامت تک بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بھالی مقصود کے خطوط میں کوئی نہ کوئی نئی اسکیم تو ہوتی ہے۔ لیکن تادم تحریر کو کوئی اطلاع یہ نہیں ملی ہے کہ وہ کال بارگاہ کر رہے ہیں اور نہ ہم کو اُمید ہے کہ وہ کبھی کچھ کریں گے، البتہ ان کا دماغ ضرور اکی قابل ہے کہ مغربی تاجران کا سر کٹوا کر رکھ لیں۔



تعجب ہے کہ بھالی مقصود اپنے متعلق ایک ایک بات اور  
 پوشیدہ سے پوشیدہ راز خواہ وہ ہمارے لئے باغث و غیبی  
 نہ ہو اپنے نفلوں میں لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے لیکن ایذا تبادہ  
 نشینی کی داستان انہوں نے کبھی نہ لکھی اور اپنے کسی خط میں  
 اس طرف اشارہ بھی نہ کیا کہ وہ استدر مقدس انسان بن گئے  
 ہیں ہم کو تو یہ قسمت اس وقت عیوم ہوا جب انہوں نے حضرت  
 محمدؐ مہکڑ رشتہ مقدس سرہ کے غریب مبارک کا دلوں کا رڈ بھیجا  
 جس کے نیچے دہن دار نام

شاہ مقصود عالم سجاد نشین درگاہ حضرت مخدوم گلزار  
شاہ قدس سرہ :

لکھا ہوا تھا ۔

ہم نے پہلے تو کارڈ کو بار بار آنکھیں مل مل کر دیکھا اور  
پھر نہایت بیتابی کے ساتھ ہوسٹل کے ان تمام ساتھیوں  
کو دکھایا یا جو بھائی مقصود، لاجول و لا قوۃ بلکہ استغفر اللہ شاہ  
مقصود عالم کے بھی ساتھی رہ چکے تھے، اس کارڈ کو دیکھ کر سب  
کی متفقہ رائے یہی تھی کہ جس طرح بھی ہوسکا عرس میں سب  
کے سب شریک ہوں گے اور بھائی مقصود کی سجادہ نشینی دیکھیں  
گے، چنانچہ تاریخ مقررہ پر یہ قافلہ یحییٰ آباد روانہ ہو گیا اور  
بھائی مقصود کو اطلاع دے دی کہ ہم سب آ رہے ہیں ۔

اسٹیشن پر پہنچ کر ہم کو امید تھی کہ بھائی مقصود استقبال  
کے لئے موجود ہوں گے لیکن ہم کو تعجب ہوا کہ وہ نہ تھے،  
البتہ دو خدام درگاہ ہم کو اسٹیشن پر لے ۔

میں نے پوچھا

”شاہ صاحب نہیں آئے؟“

جواب ملا ۔

”حضور میاں صاحب قبلہ اس وقت غسل شریف میں تھے

اور اب محفل سماع میں ہوں گے۔“

ہم لوگ بھی اسٹیشن سے پہلے درگاہ شریف سے متعلق

مہان خانہ میں گئے اور وہاں سے براہ راست محفل سماع میں

پہنچ گئے جہاں ایک مجمع لگا ہوا تھا اور ڈھولک کی تھاپ

کے ساتھ

دل بردی دجاں بردی بیتاب و توں کردی

کی تکرار جاری تھی، ہم بھی مجمع کو ہٹاتے ہوئے کسی طرح آگے

بٹھے، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک مسند پر گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے

حضرت شاہ صاحب قبلہ بیٹھے جھوم رہے ہیں آنکھیں نیچی ہیں

اور چاروں طرف نور کی بارش ہو رہی ہے، ڈاڑھی تو خیر و بکا ہے

لیکن ہنڈے ہوئے سر کے بجائے اب معطر اور بلدار کا کلیں مانوں

پر بہا رہی ہیں، گلے میں بار پڑے ہوئے ہیں، ہاتھوں اور پیروں

میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ گیردے رنگ کا کرتہ گلے میں ہے

اور زرد رنگ کی تہ بند ہے، ایک پشتہ خارا ایک خامدان

ایک گلدان سامنے رکھا ہوا ہے پیچھے ایک خادم درگاہ حضور

لئے کھڑا ہے اور اس کی کجور کا پنکھا فراٹے کے ساتھ چل

رہا ہے۔ آپ کے ارد گرد معتقدین دوزخ و آداب سے گردن جھکائے  
 ہوتے بیٹھے جھوم رہے ہیں، اور کبھی کبھی کوئی شخص روپیہ لے کر آگے  
 بڑھتا ہے تو آپ اس کو لے کر اپنے دست مبارک سے قوال کو  
 دے دیتے ہیں۔

ہمارے رہنما خدام جو ہم کو اسٹیشن سے لائے تھے پہلے  
 ہی بتا چکے تھے کہ ہم کو بھی نذر پیش کرنا ہوگی۔ لہذا ہم سب  
 کی مٹھی میں ایک ایک روپیہ تھا اور ہم موقع کی تلاش میں  
 تھے کہ کس طرح شاہ صاحب قبیلہ کی قدم بوسنی حاصل کریں  
 کہ یکا یک شاہ صاحب نے بڑی زور سے

”دل بُردی“ کا نعرہ لگایا ”حق ہے“ اور سر کو کانٹل پیٹکار  
 انداز سے پلے درپلے بنیش دے کر۔

”دل بُردی“ دل بُردی حق ہے، دل بُردی ”کہتے ہوئے  
 کھڑے ہو گئے، ان کے ساتھ ہی تمام حاضرین محفل مع قوالوں  
 کے کھڑے ہو گئے اور قوالوں نے اور بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر  
 دل بُردی، دل بُردی کی تکرار شروع کر دی۔

اب شاہ صاحب بھاؤ بتاتا کرناج رہے تھے قوالوں  
 پر روپیہ کی بارش ہو رہی تھی۔ اور وہ بھی اس پر تلے ہوئے

تھے کہ اگر آج "دل بروی" کہتے کہتے ان کی جان بھی نکل جائے  
 گی تو کول پرواہ نہیں بلا سے روپیہ تو گھر بھر دے گا شاد صاحب  
 تھے کہ رقص کے تمام کمالات صرف کئے دیتے تھے۔ آخر کار تک  
 کر شاد صاحب قبلہ سجدہ میں گر گئے لیکن "دل بروی" کا وظیفہ  
 اب بھی زبان مبارک پر تھا۔

ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا لیکن حاضرین  
 میں سے ایک بزرگ برابر ہم کو منع کر رہے تھے کہ بری بات  
 ہے میاں صاحب قید کو تو حال آ رہا ہے اور تم ہنستے ہو۔  
 میاں صاحب بڑی دیر تک سجدے میں پڑے "دل  
 بروی" کرتے رہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ قوالوں کے جان  
 دینے سے پہلے ہی اٹھ کر آدمیوں کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھ گئے  
 ان کے ہاتھ تمام حاضرین بھی بیٹھے اور قوال بھی اس "دلی بروی"  
 کے کٹا پٹے سے بھاگے بڑھے ورنہ اب تک تو یہی معلوم ہو رہا  
 تھا کہ ان دنوں یہ کسی خراب ریکارڈ پر سونی اٹک کر رہ گئی  
 ہے شاد خدا کرے اس تباہی نے دم لیا اور ہماری ہنسی بھی  
 کی تو ہم سب نے اس کے بڑھ کر یہ لہجہ دیکر سے نڈھال ہو گئی  
 تھی۔

شاہ صاحب نے ہم سب کو نہایت محبت سے اپنے پاس بٹھایا اور حکم دیا کہ چوکی بدل دی جائے اب کی مرتبہ کوئی بی صاحبہ چمکتی ہوئی آگے بڑھیں اور ہزاروں مرتبہ لطیف کنکھاروں کے بعد گلا اور ریشمی رومال سے لپٹا ہاتے رنگین کو صاف کر کے وہی پٹا گانا شروع کر دیا جو قیامت تک ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا اور نہ ہم سمجھ لیکن شاہ صاحب تھے کہ ماہرین فن موسیقی کی طرح گردن اور بھویں چلا رہے تھے۔ اور وہ مسماۃ تھیں کہ شاہ صاحب کو سلام پر سلام کر رہی تھیں خدا خدا کر کے ان کی یہ فقیرانہ صدا ختم ہوئی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ انہوں نے ج

نظارہ کا نظارہ روپوشی کی روپوشی

شروع کر دی ایک توجوش کی غزل پھر ان مسماۃ کی آواز اور سب سے زیادہ قیامت یہ کہ کڑیل جوان سجادہ نشین ، نتیجہ یہ ہوا کہ ان بی صاحبہ کو بالکل شاہ صاحب کی آغوش میں آکر گانا سنا پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاہ صاحب کی آغوش مبارک میں بیٹھی ہوئی گارہی تھیں اور شاہ صاحب آنکھیں بند کئے ہوئے خدا جانے کن روحانی منازل



میں گم تھے البتہ ہم لوگوں کو پسینے آرہے تھے کہ ہم اس قدر  
 قریب کیوں بیٹھے ہیں کہ یکایک شاہ صاحب قیلہ نے کاکلین  
 پھٹکار کر اور مسماۃ کے سر نیاز نہیں بلکہ سر نیاز پر ہاتھ پیر کر  
 کہا:

یہ حسن فروش کی دکان ہے یا چلن

اور ادھر چار پانچ معتقدین نے روپیہ لاکر پیش کیا  
 جو شاہ صاحب کے ہاتھ سے ہوتا ہوا ان صاحب کے ہاتھ  
 میں اور بی صاحب کے ہاتھ سے ہوتا ہوا اسما دجی کی سازگی میں  
 پہنچ گیا لیکن شاہ صاحب تھے کہ برابر عالم وجد میں مغنیہ کو  
 "لحنت جگر بنائے ماستے تھے وہ تو کہیے کہ عین اسی وقت مغرب  
 کی اذان ہوئی اور محفل سماع برخواست ہم نے دل میں کہا  
 موزن مرحبا بروقت بولا

تیری آواز کے اور مدینے

شاہ صاحب بھی کھڑے ہو گئے اور ہم سب کو لے کر  
 اپنی نشست پر گئے۔ اس پہر سچے حالانکہ ہم سمجھے تھے کہ مسجد  
 بنائیں گے بلکہ یہ ہم نے کہا کہ نماز نہیں پڑھو گے تو ایک  
 خادم کو حکم دے دیا کہ آپ کو مسجد پہنچا دو اور خود وہیں بیٹھے

رہا

جب ہم مسجد سے واپس آئے تو شاہ صاحب کا کمرہ اندر  
کا اکھاڑہ ہو رہا تھا اور خود شاہ صاحب پرلوں کے بیچ میں  
راجہ اندر بنے بیٹھے تھے ایک ملوفان رنگ و بوی تھا جو ہوش و  
حواس کو اڑا سنے لئے جا رہا تھا۔

ہم لوگوں کو بھی اسی پرستان میں بیٹھنا پڑا بعض اوقات  
مقصود کے حالات مضحکہ خیز اور شرمناک معلوم ہوتے تھے لیکن  
اس وقت بیچ پوچھیے تو وہ ایک قابل رشک شخصیت بنا ہوا بیٹھا  
تھا کہ کوئی تو اپنے دست ناز..... سے گلوریاں بنا بنا  
کر دے رہا تھا کوئی اپنی نازک کلائیوں سے پنکھا جھل رہا تھا،  
کسی سے شاہ صاحب ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور کوئی شاہ  
صاحب سے روٹھ روٹھ کر اپنی کافر برہی سے فضاؤں کو  
سین بنائے دیتا مختصر یہ کہ ہمارے لئے یہ وقت سخت  
ترین امتحان کا وقت تھا اور ہم کو خود چیرتا ہے کہ اس  
حال طلب ماحول میں ہم کس طرح زندہ رہیں گے۔ آپ کہیں گے کہ  
بے غیرت تھے۔

شاہ صاحب نے قیامت سے قیامت یہ فرمالی کہ

موت کی فرشتہ صاحبہ سے ہم لوگوں کا تعارف کرا دیا اور اس  
 ایک تعارف نے تمام حضرات کو ہم لوگوں کی طرف متوجہ کر دیا،  
 کنگن والے ہاتھوں سے کمائی دار سلام ہونے لگے اور مجبوراً  
 ہم کو گردن جھکا کر اور آنکھیں پیرا کر جواب دینا پڑا، پھر  
 قیامت یہ آئی کہ ہم کو بھی انہیں ہاتھوں کی بنی ہوئی قاتل گلوٹیاں  
 کھانا پڑیں۔ یعنی

زہر دیں اس پر یہ تاکید کہ پینا ہوگا  
 غالباً شاہ صاحب نے ہم کو خوش کرنے کے لئے  
 بائی جی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔  
 ”کیا آپ کو میرے احباب کی صحبت سے الجھن ہو رہی  
 ہے؟“

بائی جی نے غارت گرتیم کے ساتھ فرمایا۔  
 ”آپ تو میاں ایسی باتیں کرتے ہیں۔“  
 ہم سے شاہ صاحب نے فرمایا۔  
 ”صاحب یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ جب آپ مفصل طور پر  
 ملیں گے تو پتہ چلے گا۔“  
 ایک اور نازک بدو نے کہا۔

”میاں یہ مشکل ملاقات کیسی؟“

ہنس کر بولے ،

”تم بڑی شرمیلے ہو۔“

اور ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

”واقعی یہ عجیب چیز ہیں ، گلا تو ماشاء اللہ ایسا ہے کہ انسان کو پاگل بنا سکتی ہیں اور پھر مذاق بلند ہے جو سناتی ہیں قیامت کی چیز سناتی ہیں ۔ اگر یہ آپ حضرات سے کچھ خوش نہیں ہیں تو یہی وجہ ہے کہ اب تک انہوں نے کچھ نہیں سُنایا۔“

میں نے کہا۔

”تو آپ فرمائیے کہ ہم لوگوں کو محروم نہ رکھیں۔“

کان پر ہاتھ رکھ کر بولے ۔

”نا بابا میں اتنی جرات نہیں رکھتا ۔ میں تو ان کو اپنی سرکار

سمجھتا ہوں۔“

بائی جی نے ٹھنک کر کہا ۔

”واہ میاں ہم کو یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں۔“

بائی جی کی والدہ نے کہا ۔

”تو سنا دو کچھ، میاں تو ہمیشہ اسی طرح فرمائش کرتے

ہیں۔“

باقی جی نے اپنی والدہ کے حکم کی تعمیل میں بغیر ساز کے  
گلاصاف کر کے فانی کی غزل شروع کی، ج

ایک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی

واقعی باقی جی بہترین مقنیہ تھیں مگر ایسی بھی نہیں کہ پہلے

ہی مصرع سے بھائی مقصود بر نزع کا عالم طاری ہو گیا، ان کی  
کاکلین ہنسنے لگیں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے لوگوں پر دو ہڑ پڑنے  
لگے، ”حق ہے“ کے نعرے بلند ہونے لگے اور جس رقت باقی جی  
نے یہ شعر پڑھا ہے س

اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس

ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی کا

بس بھائی مقصود ”الا اللہ“ کہہ کر اچپک پڑے اور ساتھ

ہی ساتھ ان کے سینہ سے تیز قسم کی روشنی بجلی کی طرح تڑپ کر نکلی

اور غائب ہو گئی ادھر حاضرین اور حضرات فوراً سجدہ میں گر پڑے

اور ہم لوگوں پر بھی اس معجزے سے وہ دہشت طاری ہوئی کہ سب

اپنی اپنی جگہ پر کانپنے لگے اور وہ باقی جی بھی ششدر ہو کر رہ گئیں۔

شاہ صاحب پر اب سکوت کا عالم طاری تھا اور تمام  
حاضرین اور حضرات دم بخود بیٹھے تھے۔ ہم لوگ بھی نقشِ حیرت  
بنے ہوئے اس معجزے پر غور کر رہے تھے کہ شاہ صاحب نے  
تخلیہ کا حکم دیا اور سوائے ہم لوگوں کے سب کو وہاں سے ہٹا دیا  
گیا۔

اب بھالی مقصود کے تقدس کا ہم لوگوں پر بھی سکھ بٹھ گیا  
تھا بلکہ ہم لوگوں کے لئے تو وہ تہایت خوفناک چیز بن گئے  
تھے، مگر سب سب چلے گئے تو بھالی مقصود نے اپنی پران  
لے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیں۔  
”ہاں جی اب بتاؤ کیا حال چال ہیں۔“  
میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔  
”حضور کی دعا چاہیئے۔“  
کہنے لگے۔

”تمہارے لئے میں حضور تھوڑی ہوں۔ حضور وہ کہتے ہیں  
جن کے سامنے مجھ کو مجبوراً پیکرِ دغا و فریب بن کر بیٹھنا پڑتا  
ہے ورنہ میری کولِ وقعت ہی نہ ہو۔“  
میں نے پھر دست بستہ کہا۔



”سنو ر یہ کیا فرما رہے ہیں آپ کا مرتبہ ہم کتنا بڑا روں سے  
بہت بلند ہے۔ آپ خدا سے نزدیک تر ہیں اور خدا کے محبوب  
بندوں میں ہیں، آپ کے دل میں طور والی کبلی آج بھی فروزاں ہے،  
تہتہ لگا کر اور ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔“

”تم بھی بڑے بیوقوف ہو، ارے یار یہ تو ان گدھوں کو  
بیوقوف بنانے کے ہتھکنڈے ہیں نہ کوئی تجل سے نہ تجلی البتہ  
یہ دیکھو ایک بیڑی ضرور لگی ہوئی ہے جس کا ہٹن دبانے سے  
کڑننے کے نیچے روشنی ہو جاتی ہے اور یہ جاہل اس کو میرا تعبد  
بلکہ معجزہ سمجھتے ہیں کب جاتی یہ بھی ایک تجارت ہے۔ اور کچھ نہیں  
اگر میں یہ ترکیبیں نہ کروں تو یہاں نہ یہ چیل چیل ہو نہ یہ میرا مرتبہ،  
ہم سب نے حیرت سے سن کر کہا،

”یار تم تو بڑے بھاری ڈاکو ہو۔“

کہنے لگے۔

”بس چپ رہو، چلو درگاہ شریف میں فائزہ“

وہ ہم سب کو لے کر شاہ صاحب مزار پر۔

کوئی اور اسٹن میں شاہ صاحب کے قدموں کی خاک  
کو پٹانے کے لئے اٹھاتا تھا اور کوئی اپنے بچے

کی تہ بند مبارک سے چھو لیتا تھا۔ اور مسافحوں کا یہ حال تھا کہ  
ایک قدم چلنا بھی مشکل تھا۔ بمشکل تمام ایک گھنٹہ کے بعد درگاہ  
شریف پہنچے جہاں ہم لوگوں نے فاتحہ پڑھا اور شاہ صاحب  
نے خدام کو حکم دیا کہ ہم لوگوں کے ساتھ خاص قسم کا تبرک کر دیا جائے  
چنانچہ نہایت اعلیٰ قسم کی سیر سیر مٹھالی ہم میں سے ہر ایک  
کے لئے لی گئی۔ اور گنگلے اس کے علاوہ تھے۔

درگاہ شریف سے رخصت ہو کر ہم لوگوں نے نہایت  
پُر تکلف کھانا کھایا اور رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب سے  
وہ روپے چھین لئے جو نذر میں پیش کئے تھے۔  
بھائی مقصود ابھی تک توسیخاؤ نشینی کر رہے ہیں۔  
عاقبت کی خبر خدا جانے

ختم شد

# مقبول عام شعری مطبوعات جو ہماراں دستیاب ہیں

تلخکاں

ساحر لدھیانوی ۹/- روپے

رم آہو

عبدالحمید عدم ۸/- روپے

دیوان غالب

غالب ۱۸/- روپے

نگار خانہ

عبدالحمید عدم ۸/- روپے

آموختہ

قتیل شفقانی ۱۵/- روپے

بے آواز گلی کوچوں میں

احمد فراز ۱۰/۵۰ روپے

مطربہ

احمد ندیم قاسمی ۹/- روپے

سرور و سمن

عبدالحمید عدم ۱۰/- روپے

چارۂ درد

عبدالحمید عدم ۱۰/۵۰ روپے

حُسامی بک ڈپو پبلی کمان، حیدر آباد (لہجہ)



# ہماری خاص مطبوعات

چراغ تلے (مشتاق یوسفی) ۱۲/-	آدمی نامہ (مجتبیٰ حسین) ۹/-
خاکم بدین " " ۱۲/-	بالآخر " " ۱۲/-
بہر و پیا (شوکت تھانوی) ۶/-	تکلف برطرف " " ۱۲/-
خبیطی " " ۱۵/-	قصہ مختصر " " ۱۲/-
مکرر ارشاد " " ۱۲/-	قطع کلام " " ۱۲/-
پہلی بیگم " " ۱۰/-	جاپان چلو جاپان چلو " " ۱۲/-
ہم زلف " " ۱۲/-	بہر حال " " ۱۲/-
قہقہے " " ۸/-	ذرا مسکرا دو (طاہر قریشی) ۱۰/-
الٹی قبر (ابراہیم حبیس) ۱۳/-	ذکر یار چلے (مرزا ظفر الحسن) ۱۸/-
پتے کی بات " " ۱۸/-	عمر گزشتہ کی کتاب " " ۱۵/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں (ابن انشاء) ۲۰/-	
دکن اداس ہے یارو (مرزا ظفر الحسن) ۱۰/-	

حسامی بک ڈپو محلی کمان، حیدرآباد

رضی

ماہِ آرا و بکوی



مطبوعات حسائی بک ڈپو

مطلع عرض ہے

شعری مجموعہ

دلاور فگار

جاناں جاناں

شعری مجموعہ

امیر خسرو

ماہِ آرا

مجتبیٰ حسین

غم گزشتہ کی کتاب

مرزا ظفر احسن

ذکرِ یاد چلے

مرزا ظفر احسن

دکن اُداس ہے یارو

مرزا ظفر احسن

چلو جاپان چلیں

مجتبیٰ حسین

ذرا مسکرا دو (ذریعہ)

ذکرِ طاہر قریشی

قصہ مختصر (ذریعہ)

مجتبیٰ حسین

قطع کلام

ذریعہ

مجتبیٰ حسین

گھسا بڑا پچکا بڑا

حقیقت عنایت تہ

تکلف برطرف

مجتبیٰ حسین

ششقی (شعری مجموعہ)

سعید شہیدی

ادی نامہ

مجتبیٰ حسین

بالآخر

مجتبیٰ حسین

ورق انتخاب

شعری مجموعہ

نورِ دلالت

ادبی کتابوں کا واحد مرکز

شہر نگاراں  
سبط حسن (ذریعہ)

شک قمر

ذریعہ

نورِ جلد نوی

حسائی بک ڈپو پھلی کمان حیدر آباد  
ناشر  
فون نمبر ۵۳۳۸